August 1995 • Issue 225 • Rs. 10

تاریخ ایک اعتبار سے گزرے ہوئے ماضی کی داستان ہے
اور دوسرے اعتبار سے حال اور مستقبل کا نصیحت نامہ

The Alhambra Palace, Granada, Spain

سفرنامۂ اسپین

اسپین کی مشہور الکلا یونی ورسٹی (University of Alcala) کے ریکٹر ڈاکٹر گالا (Mankel Gala) کے دستخط سے ان کا خط مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۹۴ ملا۔ اس میں مجھے میڈرڈ کی تین روزہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ انٹرنیشنل کانفرنس ۲۸۔۳۰ نومبر ۱۹۹۴ کو تین سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام) کے اشتراک سے ہوئی۔ یہ امن عالم کے بارے میں تھی اور اس کا موضوع تھا :

Three Religions: A commitment for peace

اس دعوت نامہ میں مجھے خصوصی مہمان (special guest) کے طور پر مذکورہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق اسپین کا سفر ہوا۔

اس سفر کا پہلا سبق آموز تجربہ اس وقت ہوا جب کہ مجھے اس کا "کوپن" ملا۔ ہوائی سفر کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ آدمی متعلقہ ایر کمپنی سے ٹکٹ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد ایر پورٹ پر اسے بورڈنگ کارڈ دیا جاتا ہے۔ اس بار پی ٹی اے کی بنیاد پر ایر فرانس سے ہمیں جو چیز دی گئی وہ معروف ٹکٹ نہ تھا۔ بلکہ چار کوپن جو گویا ٹکٹ بھی تھا اور بورڈنگ کارڈ بھی۔ مغربی ممالک اسی طرح اپنی ترقی کا سفر مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ مگر ہندستان جیسے ملکوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

۲۷ نومبر کی صبح کو گھر سے ایر پورٹ جانے کے لیے نکلا تو سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑک پر حسب معمول گاڑیاں دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔ قدیم زمانہ کے ایک شاعر نے کہا تھا :

ہوئی صبح اور ادھر ہم کان پر رکھ کر قلم نکلے

موجودہ زمانہ کا آدمی شاید کہے گا کہ صبح ہوئی اور ہم اپنی گاڑی لے کر روانہ ہوئے۔ مشینی انقلاب نے قدیم و جدید میں جو فرق کیا ہے اس کی یہ ایک علامتی مثال ہے۔

دہلی کے انٹرنیشنل ایر پورٹ پر داخل ہوا تو اندر کا وسیع ہال پلاسٹک کے بڑے بڑے بنڈلوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک پر لکھا ہوا تھا، باکو (Baku) یہ سب ایر ٹرانسپورٹ کے ذریعہ روس بھیجے جا رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام بنڈل سلے ہوئے لباس اور گرم کپڑے سے بھرے

ہوئے ہیں۔ روس سے ہندستان جنگی ہتھیار خرید رہا ہے۔ مگر ضرورت کی چیزوں کے لیے خود روس مجبور ہے کہ وہ ان کو ہندستان اور دوسرے ملکوں سے خریدے۔ اشتراکی نظام کی یہ غیر متوازن ترقی بھی کیسی عجیب ہے۔

انتظار گاہ کے اندر دیوار پر دو شیروں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ شیر لکڑی کاٹ کر اور اس پر قدرتی رنگ دے کر بنائے گئے تھے۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ دو شیر کھڑے ہوئے ہیں۔ شیر فطرت کا ایک عجیب مظہر ہے۔ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہوتا ہے۔ مگر ماہرین کا کہنا ہے کہ شیر سب سے زیادہ غیر جنگجو جانور ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہونے کے ساتھ اعراض کا بادشاہ بھی ہے۔

ایرپورٹ کی انتظار گاہ میں تھا کہ قریب کی خالی کرسیوں پر کچھ نوجوان مرد اور عورت آکر بیٹھ گئے۔ یہ سب مغربی سیاح تھے اور انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میرا رخ الٹی طرف تھا مگر قریب ہونے کی وجہ سے ان کی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ تم نے دہلی میں کیا کیا دیکھا۔ بتانے والے نے جن چیزوں کے نام بتائے ان میں سے ایک "جامع مسجد" بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ دہلی کی تاریخی جامع مسجد کو دیکھنے کے لیے ہر روز ملکی اور غیر ملکی لوگ کثرت سے آتے ہیں۔ گویا مدعو خود داعی کے پاس آرہا ہے۔ دور جدید میں سیاحت کے فروغ کی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے۔ جامع مسجد کے ساتھ اگر ایک دعوتی شعبہ ہوتا تو اس کے ذریعہ ملک میں اور ملک کے باہر زبردست دعوتی کام ہو سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بے فائدہ سیاسی شغف نے تمام دعوتی امکانات کو برباد کر رکھا ہے۔

دہلی سے ایر فرانس کی فلائٹ نمبر ،، اکے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایر فرانس کی فلائٹ میگزین اٹلس (atlas) دیکھا۔ مگر اس میں یا فیشن والی چیزوں کے اشتہارات تھے یا سیاحوں کی دل چسپی کی باتیں تھیں۔ کوئی خاص مضمون قابل ذکر نہیں ملا۔

ڈیڑھ سو صفحہ کے اس خوب صورت میگزین میں ایک سادہ شیٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ برائے تجاویز (suggestions) تھی۔ اس میں آٹھ زبانوں میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ پرواز کے دوران یا گراؤنڈ پر ہماری سروس کے بارہ میں آپ جو بھی تبصرے (comments) لکھنا چاہیں بلا تردد لکھ کر ہمیں یا دستی

طور پر دے دیں یا بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ آٹھویں نمبر پر عربی عبارت تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

الرجاء تزويدنا بملاحظاتكم على خدمتنا على الأرض واثناء السفر وان تدونوا كذلك مقترحاتكم على هذه البطاقة ثم ارسالها بالبريد أو تسليمها الى طاقم الطائرة.

شكرا. الخطوط الجوية الفرنسية.

ہوائی کمپنی ایک تجارتی ادارہ ہے۔ تاجر اپنے بارہ میں لوگوں کا تبصرہ جاننے کا حریص ہوتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کرکے اپنی تجارت کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنائے۔ اسی طرح داعی بھی مدعو کی ہر بات کو نہایت دھیان کے ساتھ سنتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح اس کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مدعو کے مزاج کو سمجھ کر اپنی دعوت کو اس کے لیے زیادہ موثر اور قابل قبول بنا سکے۔

ہوائی جہاز کی سواری مجھ کو ایک خدائی نشانی نظر آتی ہے۔ ہوائی جہاز کی ایک عجیب صفت یہ ہے کہ وہ انسان کی اُس کمزوری (vulnerability) کو ممثل کرتا ہے جو زمین کے اوپر اسے حاصل ہے۔ زمین فٹ بال کی مانند ایک بڑا سا گولا ہے جو خلا میں تیز رفتاری کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ خلا میں گردش کرتے ہوئے اس کرہ پر انسان آباد ہے۔ زمین کی اس مسلسل خلائی پرواز میں اگر ذرا سا بھی خلل پڑ جائے تو ایک لمحہ میں پوری انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔

کرۂ زمین پر اپنی اس غیر محفوظیت کو انسان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا، اس لیے وہ اس کو محسوس بھی نہیں کر پاتا۔ ہوائی جہاز آدمی کی اسی غیر محفوظ حالت کا محدود سطح پر ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ ہوائی جہاز انسان کی حیثیتِ عجز کی گویا ایک مشینی یاد دہانی ہے۔

اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے کہ آدمی اس سے روحانی تجربہ حاصل کرے۔ مگر یہ روحانی تجربہ صرف اس کے حصہ میں آتا ہے جو میٹر میں نان میٹر کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

راستہ میں وال اسٹریٹ جرنل (بروسیلز) کا شمارہ ۲۵ - ۲۶ نومبر ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں سب کی سب تجارتی نوعیت کی خبریں تھیں۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ترکی کپڑے کے اکسپورٹ میں فرانس اور اٹلی کے بعد یورپ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ پچھلے سال اس نے چار بلین ڈالر سے زیادہ کے کپڑے اکسپورٹ کیے۔ مگر اب مقابلہ کی وجہ سے ترکی کی یہ صنعت زوال کی طرف جا رہی ہے۔ ایک ترک اکسپورٹر نے کہا : Ours could soon be a dying industry. (p. 4)

ایر ہوسٹس مشروبات کی گاڑی لے آئی۔ میرے قریب کی سیٹ پر جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے وہسکی مانگی۔ میں نے آرنج جوس کے لیے کہا۔ میز پر جب دونوں گلاس رکھے گئے تو میں نے دیکھا کہ دونوں مشروب کا رنگ بالکل یکساں ہے۔ اگرچہ ایک شراب تھی اور دوسرا خالص آرنج کا رس۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا میں چیزیں مشابہ انداز میں پیدا کی گئی ہیں۔ حتی کہ حق جس طرح عمدہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے، اسی طرح باطل بھی خوب صورت الفاظ میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ مشابہت برائے امتحان ہے، اس لیے آدمی کو موجودہ دنیا میں بے حد چوکنا ہو کر رہنا ہے۔ ورنہ وہ ایک مشروب کو فروٹ جوس سمجھ کر پینے لگے گا۔ حالاں کہ بعد کا انجام بتائے گا کہ وہ پھل کے رس کے رنگ میں شراب تھی جس کو وہ نادانی اور بے شعوری کے تحت پی گیا۔

جس ہم سفر نے شراب لی تھی، ان سے بات کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ شراب پینے سے آپ کو کیا فائدہ ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ کیوں شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تناؤ دور کرنے (relaxation) کے لیے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے۔ مگر وہ کئی گھریلو مسائل سے دوچار ہیں، اب تک انھوں نے شادی بھی نہیں کی۔ اس لیے ذہن پر مستقل بوجھ رہتا ہے اس بوجھ کو اتارنے کے لیے وہ شراب پیتے ہیں۔ اکثر شراب نوشوں کا یہی حال ہے۔

اس جہاز میں مدراس کے ایک ہندستانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ میکانیکل انجینیر ہیں اور ان کا نام آر وجے کمار ہے۔ وہ ایک شپنگ کمپنی (اینگلو ایسٹرن شپ مینجمنٹ لمیٹڈ) میں ملازم ہیں۔ وہ پانچ سال سے سمندری جہاز میں کام کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ سمندر میں جب طوفان آتا ہے تو اس وقت آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم انتظار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نیچر کے خلاف نہیں جا سکتے :

We are supposed to wait. Because we cannot go against the nature.

انتظار بے عملی نہیں، اس دنیا میں انتظار بھی ایک عملی پالیسی ہے۔ مذکورہ مسافر کو میں نے ایک حدیث سنائی۔ اس حدیث کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں : افضل العبادۃ انتظار الفرج (کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے)

ساڑھے نو گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز فرانس کی راجدھانی پیرس میں اتر گیا۔ پیرس کا

ہوائی اڈہ غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ وہ خود ایک شہر ہے۔ میں یہاں کئی بار آچکا ہوں۔ مگر اب تک اس کا جغرافیہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کاؤنٹر پر ایک خاتون ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے میرے حلیہ سے سمجھا کہ میں بھی ایک ہندستانی ہوں۔ انھوں نے میرا ٹکٹ کمپوٹر پر چیک کرنے کے بعد کہا: پتاجی، آپ کی فلائٹ "ٹرمنل ون" سے ہے۔ وہاں تک آپ کو بس سے جانا ہوگا۔ آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ میں ابھی آپ کو لے جا کر بس پر سوار کرا دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہوائی کمپنی کی بس میں تھا۔ یہ بس پیرس کے مختلف حصوں سے گزرتی رہی یہاں تک کہ اس نے مجھے ٹرمنل ون پر پہنچا دیا۔

یہاں ایرپورٹ پر مجھے باتھ روم جانا تھا۔ میں اتفاق سے معذوروں کے باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس کے اندر ہر قسم کی سہولتیں موجود تھیں۔ حتی کہ اس کے اندر انٹر کام بھی لگا ہوا تھا۔ تاکہ معذور شخص کو کوئی مشکل پیش آجائے تو فوراً وہ انٹر کام پر بتا کر اپنی مدد کے لیے ایرپورٹ کے آدمی کو بلا سکے۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں بھی ایک معذور ہوں۔ دنیا میں معذور شخص کو خصوصی رعایت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ کاش آخرت میں بھی مجھ کو معذور قرار دے کر میرے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کیا جائے۔

فرانس میں تقریباً ۱۵۰۰ چھوٹی بڑی مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد کے بارہ میں قطعی اعداد و شمار حاصل نہیں۔ تاہم عام اندازہ یہ ہے کہ یہاں پانچ ملین مسلمان آباد ہیں۔ فرانسیسی مسلمانوں میں زیادہ تر مراکو، الجزائر اور تونس وغیرہ سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ فرانس میں مسلمانوں کی تقریباً نوّے تنظیمیں پائی جاتی ہیں۔ حال میں ان کا ایک وفاق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۹۰ میں پیرس میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: الحریات وحقوق الانسان فی الاسلام۔

فرانس کی آبادی میں تقریباً ۸۰ فی صد کیتھولک عیسائی ہیں۔ پندرہ فی صد مسلمان ہیں۔ اور پانچ فی صد میں پروٹسٹنٹ اور یہودی ہیں۔ آپ فرانس کے کسی بھی حصہ میں جائیں، آپ کی ملاقات کسی نہ کسی مسلمان سے ہوجائے گی۔ خواہ وہ ایرپورٹ ہو یا کوئی کھیت۔

پیرس کے ایرپورٹ پر ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ انگریزی جانتے تھے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ فرانس ہمیشہ "اسلام دشمنی" میں امریکہ اور مغربی ملکوں کے

ساتھ رہا ہے۔ لیکن آج اسی ملک میں زبردست اسلامی لہر آئی ہوئی ہے :

But now a severe Islamic wave is sweeping the same nation.

مگر سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ "اسلامی لہر" کا یہ نظریہ زیادہ تر خوش فہمی پر مبنی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فرانس کے چالیس ہزار مسلم نوجوان مکمل طور پر اسلام کے زیر اثر ہیں۔ مگر جب میں نے مزید سوالات کیے تو معلوم ہوا کہ یہ وہی نوجوان ہیں جو بے روزگاری کا شکار ہیں یا اس احساس میں مبتلا ہیں کہ فرانس کی سوسائٹی میں انھیں باعزت مقام نہیں ملا۔ دوسرے لفظوں میں اس اسلامی لہر کے پیچھے اصل محرک مادی محرومی کا احساس ہے نہ کہ آخرت کی جواب دہی کا احساس۔ یہ اسلام کا اکسپلائٹیشن ہے۔ اور اسلام کے اس قومی اکسپلائٹیشن کا یہ الٹا نتیجہ نکلا ہے کہ، مذکورہ فرانسیسی مسلمان کے اعتراف کے مطابق، یہاں کی رائے عامہ شدت سے مسلمانوں کے خلاف ہوگئی ہے :

Public opinion is extremely against Muslims.

ان انتہا پسند مسلمانوں نے اسلام کی نمائندگی اس طرح کی ہے کہ فرانسیسیوں کو نظر آتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ان کے سسٹم سے ٹکراتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے بہت سی غیر ضروری رکاوٹیں یہاں کے مسلمانوں کو پیش آرہی ہیں۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسک (Chartes Pasqua) نے شہر لیان (Lyon) کی مسجد کے افتتاح کے وقت اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں فرانس میں صرف اسلام نہیں چاہیے بلکہ ہمیں وہ اسلام چاہیے جو فرانس کا اسلام ہو :

We would not have just an Islam in France. There must be an Islam of France.

فرانس کے مسلمانوں میں بہت تھوڑی تعداد کو چھوڑ کر سب کے سب نارتھ افریقہ کے مہاجرین ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں فرانس نے ۱۸۳۰ میں الجیریا کو فتح کیا، ۱۹۰۹ میں اس نے افریقی صحارا کے بڑے حصہ پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ تیونس کو اس نے ۱۸۸۱ میں فتح کیا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ میں مراکو کو اپنی سیاسی ماتحتی میں لے لیا۔ اس وقت اسپین کو بھی مراکو کا ایک حصہ دے دیا گیا تھا۔ نارتھ افریقہ کے علاقہ پر اسی قبضہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں میں آمد و رفت بڑھی۔ اور بڑی تعداد میں افریقہ کے مسلمان اپنے ملکوں سے نکل کر فرانس میں روزگار کے لیے آگئے۔ ان لوگوں نے فرانس کو سستا مزدور فراہم کیا جس کی اس

وقت فرانس کو سخت ضرورت تھی۔

اب یہی لوگ فرانس کے شہری بن کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس طرح حالات نے مسلمانوں کو اپنے مدعو کے ملک میں پہنچا دیا تھا۔ اگر وہ معاشی حصول کے بعد صرف دعوت کو اپنا نشانہ بناتے تو یہاں ان کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ اس کی ایک انفرادی مثال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہیں۔ انھوں نے صرف علمی اور دعوتی دائرہ تک اپنے کو محدود رکھا۔ چنانچہ وہ فرانس میں ایک مقبول شخصیت بن گئے۔ مگر نام نہاد اسلام پسندوں نے کلچرل تشخص اور قومی حقوق کے نام پر فرانسیسیوں سے زور آزمائی شروع کر دی۔

اس غلط پالیسی کا یہ نتیجہ تو نہیں نکلا کہ فرانس میں ان مسلمانوں کے قومی مطالبات پورے ہو جائیں۔ البتہ یہ احتجاجی سیاست فرانس میں ان کے خلاف نفرت اور غصہ کی فصل اگا رہی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں دعوت کے مواقع برباد ہو رہے ہیں۔

پیرس میں ایک لڑکی ملی۔ اس نے اپنا نام شاذیہ بتایا۔ نام سے اس کی شخصیت واضح نہیں ہو رہی تھی۔ مزید دریافت پر معلوم ہوا کہ اس کا باپ ایک مصری مسلمان ہے۔ اس نے یہاں ایک عیسائی خاتون سے شادی کی۔ اس خاتون نے اپنا مذہب نہیں بدلا۔ اس کے بعد ان کے یہاں مذکورہ لڑکی (شاذیہ) پیدا ہوئی۔ ایک عرصہ بعد مصری مسلمان اور اس کی عیسائی بیوی میں اختلاف ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اب یہ عورت اپنی لڑکی کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہے۔

گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ اصل مسئلہ غالباً یہ تھا کہ شاذیہ کا بوائے فرینڈ گھر میں آتا تھا۔ وہ ڈرنک بھی کرنے لگی۔ ان باتوں پر اس کی ماں کو اعتراض نہیں تھا۔ مگر مصری مسلمان سخت اعتراض کرتا تھا۔ فرانس چونکہ ایک مسیحی ملک ہے، بیوی کا پلہ بھاری ثابت ہوا۔ آخر کار مصری مسلمان کی مرضی کے علی الرغم اس نے طلاق لے لی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان کس قسم کے نازک مسائل سے دوچار ہیں۔

فرانس کے مسلمانوں میں محدود تعداد نومسلموں کی ہے۔ تاہم یہ نومسلم مسلمانوں کی کسی تبلیغ سے اسلام کی طرف راغب نہیں ہوئے ہیں بلکہ زیادہ تر اپنے ذاتی مطالعہ سے اسلام کی طرف آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دورِ جدید کے "حنفاء" کہا جا سکتا ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر حق کی طلب موجود

ہے۔ تاہم بعض افراد کے اندر یہ طلب زیادہ طاقت ور صورت میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنی روحانی طلب کا جواب پاکر اس کو قبول کرلیتے ہیں۔

ایک نومسلم خاتون (مسز زرینہ) نے ایک بڑا عجیب واقعہ بتایا۔ حال میں ایک فرانسیسی عیسائی نے اسلام قبول کیا ہے۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ صرف اسلامی لٹریچر سے آشنا ہوا تھا۔ قبول اسلام کے بعد اس کا ربط مسلمانوں سے ہوا۔ اس نے بعد کو اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں اسلام سے اس وقت واقف ہوا جب کہ میری ملاقات ابھی کسی ایک مسلمان سے بھی نہیں ہوئی تھی:

Thank God I was introduced to Islam before I was introduced to a single Muslim.

فرانس میں بڑی تعداد میں مستشرق پیدا ہوئے۔ انھوں نے عربی زبان سیکھی اور اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ عام طور پر ہمارے یہاں استشراق کو اسلام کے خلاف ایک مغربی سازش سمجھا جاتا ہے مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر ایسا کرتے ہیں کہ کسی کے یہاں اگر کوئی چیز خلاف مزاج یا خلاف حق دیکھتے ہیں تو بس اسی کو جنرلائز کرنے لگتے ہیں۔ وہ آدمی کی تمام مثبت باتوں کو بھلا کر چند اختلافی باتوں ہی کو اس کی کل بات قرار دے دیتے ہیں۔

مستشرقین میں بہت سے ایسے افراد ہیں جنھوں نے اسلام کے گہرے مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرلیا۔ انھیں میں سے ایک فرانس کا مستشرق اتین دینیہ (Etienne Dinet) ہے۔ وہ ۱۸۶۱ء میں پیرس میں پیدا ہوا، اور ۱۹۲۹ء میں پیرس ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ۱۹۲۷ میں الجزائر میں اسلام قبول کرلیا۔ اس کے قبولِ اسلام کی تقریب میں عرب علماء کی بڑی تعداد شریک تھی۔ اس نے اپنا اسلامی نام ناصر الدین رکھا۔ اس کی اسلام پر کئی اعلیٰ تصنیفات ہیں۔ ان میں سے ایک فرانسیسی زبان میں لکھی ہوئی سیرتؐ (Mohamet) ہے۔ اس کی مختلف اسلامی کتابوں میں سے ایک کتاب عربی میں اشعۃ من نور الاسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق، اس کی تدفین الجزائر کے ایک گاؤں بوسعادہ میں ہوئی۔

دکتور محمود المقداد کی کتاب تاریخ الدراسات العربیۃ فی فرنسا ۱۹۹۲ میں کویت سے

چھپی ہے۔ ۳۰۰ صفحہ کی یہ کتاب فرانس میں عربی مطالعات کے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو یہ فرانسیسیوں کے لیے عربی زبان اور عربی علوم کے مطالعہ کا نہایت طاقت ور محرک بن گیا۔ اس کے بعد فرانس میں بڑے بڑے مستعرب (مستشرق) پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک اہم شخصیت ہنری ماسیہ (H. Masse) کی ہے جس نے خاص اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا ہے (صفحہ ۲۲۹)

عرب دنیا میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کے بعد فرانس نے عربوں کو فرانسیسی بنانے (فرنسۃ الشعب العربی) کی مہم چلائی تھی، مگر سیاسی اور فوجی بالادستی کے باوجود فرانس ناکام رہا۔ فرنسۃ الشعب العربی کی مہم عملاً اسلمۃ الشعب الفرنسی کے ہم معنی بن گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظریہ کی طاقت ہر دوسری طاقت سے زیادہ عظیم ہے۔

بنگلہ دیش کی مصنفہ تسلیمہ نسرین، جو اپنے وطن سے بھاگ کر سویڈن میں مقیم ہے، آجکل فرانس کے دس روزہ دورہ پر ہے۔ اس کو فرانس بلا کر انسانی حقوق کی مجاہدہ کا انعام دیا گیا ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۹۴ کو موصوفہ سے فرانس کے صدر متراں (Francois Mitterrand) نے ریلیزی پیلس میں ملاقات کی۔ تسلیمہ نسرین نے صدر فرانس کو بتایا کہ کس طرح وہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر انتہا پسند مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہو رہی ہے۔ ۲۰ منٹ کی یہ ملاقات خود پریسیڈنٹ متراں کی درخواست پر ہوئی۔ کیونکہ صدر موصوف یہ چاہتے تھے کہ وہ فرانس کی طرف سے موصوفہ کی قدر دانی کا اظہار کریں۔

نام نہاد مسلم دانشور اس واقعہ پر صدر فرانس کو برا کہیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اعراض کے اشو کو ہنگامہ آرائی کا اشو بنایا۔ اور اس طرح انتہائی غیر ضروری طور پر تسلیمہ نسرین کو ہیرو کا درجہ دے دیا۔

کسی طالب علم سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ غیر کمیونسٹوں کو رائٹسٹ اور کمیونسٹوں کو لفٹسٹ کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ذہانت کے زور پر جواب دیا ——— اس لیے کہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ وہ کبھی رائٹ (درست) نہیں ہوتے :

Because, the events in communist countries have proved that they might not be right.

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اصطلاح فرانس میں بنی۔ فرانسیسی ریولیوشن کے زمانہ میں نیشنل اسمبلی میں دو بڑے سیاسی گروپ تھے۔ کنزرویٹو گروپ بادشاہ کی حمایت کرتا تھا۔ اور ریڈیکل گروپ سسٹم میں ڈراسٹک تبدیلیوں کی مانگ کر رہا تھا۔ اسمبلی ہال میں ان کی نشستیں اس طرح تھیں کہ کنزرویٹو (شاہ پسند) ممبران اسپیکر کے دائیں طرف بیٹھتے تھے۔ اور انقلاب پسند اسپیکر کے بائیں طرف۔ اس وقت سے سیاسی اصطلاح میں انقلابی تبدیلی (radical change) چاہنے والوں کو لفٹسٹ کہا جانے لگا۔

پیرس آج کل ایک نئی تحریک کا مرکز بن رہا ہے جس کو اٹلانٹا پلس (Atlanta Plus) کہا جاتا ہے۔ ان کی مانگ ہے کہ ۱۹۹۶ میں اٹلانٹا میں ہونے والے اولیمپک گیم میں عورتوں کو بھی برابر کی حیثیت سے شریک کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۲ میں بارسلونہ (اسپین) میں جو اولیمپک کھیل ہوئے تھے، اس موقع پر یہ طے کیا گیا تھا کہ کھیلوں میں جنسی امتیاز کا خاتمہ کیا جائے۔ مگر ۳۴ مسلم ملک ابھی تک اس کے لیے راضی نہیں ہوئے ہیں۔ تحریک کی ایک پُرجوش حامی خاتون نے کہا کہ جنسی امتیاز بھی نسلی امتیاز ہی کی مانند ہے:

Sex discrimination is analogous to the racial discrimination.

میں نے ایک خاتون سے کہا کہ کیا آپ پسند کریں گی کہ اگلے اولیمپک میں فرانس کی ایک خاتون افریقہ کے ایک مرد باکسر کا مقابلہ کرے۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ خود آپ کی اسکیم کے مطابق، عورتوں کو عورتوں کے مقابلہ میں کھیلنا ہے نہ کہ مردوں کے مقابلہ میں۔ یہ تو خود ایک جنسی امتیاز ہے، پھر آپ اس کو جنسی برابری کا نام کیوں دیتی ہیں۔

پیرس میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہاں سے میڈرڈ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر آئبیرین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۳۴۴۵ کے ذریعہ طے ہوا۔ مقامی وقت کے لحاظ سے ۲۷ نومبر کی شام کو ساڑھے سات بجے جہاز روانہ ہوا۔ یہ ڈیڑھ گھنٹہ کا ایک خوش گوار سفر تھا۔ ہوائی جہاز آگے کی طرف جا رہا تھا اور میرا ذہن پیچھے کی طرف مڑ کر "فرانس میں اسلام" اور "اسپین میں اسلام" کی تاریخ کے صفحات الٹنے میں مصروف تھا۔

راستہ میں اسپینی ایر لائنز (Iberia) کی فلائٹ میگزین رونڈا ایبیریا کا شمارہ نومبر ۱۹۹۴ دیکھا۔ ۲۳۰ صفحہ کا یہ میگزین زیادہ تر سیاحوں کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ لمبا

مضمون غرناطہ کے بارہ میں تھا۔ رنگین تصویروں کے ساتھ یہ مضمون میگزین کے ۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بیک وقت اسپینی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا۔ اہل اسپین نے ایک عرصہ تک مسلم دور کو نظر انداز کیا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ اسپین کی مسلم یادگاروں کی اہمیت ان کے لیے مزید اضافہ کے ساتھ وہی ہے جو ہندستان میں تاج محل کی ہے۔ چنانچہ مضمون کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا تھا : غرناطہ، جنّت کی دوبارہ یافت ———

Granada, paradise regained

یہ مضمون یہاں سے شروع کیا گیا تھا کہ یہ عمارتیں اور یہ باغات اس لیے بنائے گئے تھے کہ ہم اپنے تصور کی جنت کا ایک پیشگی نظارہ کر سکیں۔ یہاں زمینی ماحول کو ہماری تصوراتی جنت میں ڈھالا گیا تھا۔ اندلس کا مسلم غرناطہ زمین پر جنت بنانے کی ایسی ہی ایک مثال ہے۔

مضمون کی اگلی سطروں میں بتایا گیا تھا کہ ان مسلم بادشاہوں کو ان کے علامتی شہر غرناطہ سے اور ان کی بنائی ہوئی جنتِ عدن سے نکالے جانے کے پانچ سو سال بعد اب کچھ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی کھوئی ہوئی جنت کو دوبارہ حاصل کر سکیں :

Now, five hundred years after they were expelled from Granada, their private Eden and their most emblematic city, there are some who are trying to regain that lost paradise of theirs. (p. 62)

اسپین میں داخل ہونے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ یہاں مسلمان آزاد ہیں، اور یہاں اسلام کی سرگرمیاں جاری ہیں تو میں نے کہا : ہندستان میں کچھ نادان لوگ یہ کہتے رہتے ہیں کہ انتہا پسند ہندو انڈیا کو دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ان کو زمانہ کے فرق کا علم نہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ پہلا اسپین بنانے کی کوشش ابھی کامیاب بھی نہیں ہوئی تھی کہ زمانہ نے عالمی حالات کو بدل کر "اسپین سازی" جیسے منصوبہ کا امکان ہی ختم کر دیا۔

اسپینی ایر لائنز کی اس فلائٹ میگزین (Ronda Iberia) میں اسپین کے مسلم عہد کا نہایت شاندار باتصویر تعارف کرایا گیا تھا۔ اس کو سیاحوں کے لیے اسپین کے سب سے زیادہ پُرکشش مقام کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس ذیل میں اعتراف کیا گیا تھا کہ مسلم دور کے اسپین میں موجودہ اسپین سے بہتر حالات تھے۔ مزید یہ کہ الاندلس (مسلم اسپین) کی وراثت کبھی اسپین سے ختم نہیں ہوئی

اور نہ وہ کبھی ملک بدر کی گئی۔ وہ مختلف صورتوں میں یہاں باقی رہی (اصل عبارت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)

میڈرڈ ایرپورٹ پر زیادہ وقت نہیں لگا۔ کانفرنس کی طرف سے دو خواتین موجود تھیں۔ انھوں نے ایک گاڑی میرے حوالے کی جس نے مجھے ہوٹل ایورو بلڈنگ (Hotel Eurobuilding) پہنچا دیا۔ جہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۶۶۳ میں تھا۔

ہماری گاڑی جب میڈرڈ کی سڑکوں سے گزر رہی تھی تو اس کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میڈرڈ مغربی یورپ کے بڑے شہروں کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں اسپین نے مغربی یورپ کو سائنسی ترقی کا راستہ دکھایا تھا۔ مگر آخری مرحلہ میں اسپین پیچھے اور مغربی یورپ آگے ہوگیا۔ اس کی وجہ یہاں کے مذہبی طبقہ کا غلط کردار ہے۔ انھوں نے اسپین کے مسلمانوں کے ترقیاتی پہلو کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ وہ غیر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس پہلو کو لے کر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف خوب نفرت پھیلائی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے علم کے خلاف بھی۔ اس منفی روش نے اسپین میں علمی ترقی کے عمل کو کئی سو سال پیچھے کر دیا۔

انگریز مؤرخ لین پول (Lane-Pool) نے موجودہ صدی کے آغاز میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام اسپین کے مسلمان (Moors in Spain) تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے اسپینی مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ پھر اس نے لکھا ہے کہ اسپین کی مسلم حکومت کا خاتمہ اور وہاں سے جبراً مسلمانوں کو نکالنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسپین دوبارہ اسی غیر ترقی یافتہ حالت کی طرف لوٹ گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ مسلمان اسپین سے نکال دیے گئے۔ کچھ دیر کے لیے مسیحی اسپین چمکا تھا

The people of today's Granada have now come up with an all-embracing scheme aimed at directing people's attention to the past which still surrounds them in the present, helping them in this way to retrieve it. The project, christened The Legacy of Al Andalus, is all set to become a reality next year, and its tempting selection of special tours, designed to rescue the history that lies down half-forgotten byways, is guaranteed to lure travellers on a fascinating journey through the past of these lands, back to times when there were better dreams than there are now: dreams of openness and pluralism. The legacy of Al Andalus never died, and was never conquered or expelled. It left with us its architecture, its monuments, its customs, its speech, its food, its sciences, its odours and its poems. The Granada of the Nasrids, the city of bliss in the midst of the convulsions of the Middle Ages, now wants to raise its head. (*Rondaiberia*, November 1994, page 64)

جس طرح چاند غیر کی روشنی سے چمک اٹھتا ہے - پھر گرہن آگیا - اور اسی تاریکی میں اسپین اب تک پڑا ہوا ہے :

The Moors were banished, for a while Christian Spain shone, like the moon, with a borrowed light, then came the eclipse, and in that darkness Spain has grovelled ever since. (p. 280)

مسلم اسپین کا تعارف سب سے پہلے مجھے مسدّس حالی کے ذریعہ ہوا۔ اس میں اسپین کے مسلم عہد کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا گیا ہے - مگر وہ سلبی نوعیت کا تھا۔ مثلاً مسدس کے ایک بند کا دو مصرعہ اس طرح تھا :

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے وہ اجڑا ہوا کرّ وفر جا کے دیکھے

اس کے بعد میں نے عربی یا اردو میں جتنے تذکرے پڑھے وہ تقریباً سب کے سب مرثیہ خوانی کے انداز میں تھے۔ مثلاً اقبال نے مسلم نوجوان کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ " وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا " اقبال احمد سہیل کی ایک نظم میں میں نے اس قسم کے اشعار پڑھے :

ہمیں چھائے ہوئے تھے شرق سے تا غرب دنیا میں موافق جن دنوں تھی گردش دور زماں ہم سے

مسلم دانشور اور مسلم ادیب اس قسم کی مرثیہ خوانی میں کیوں مبتلا ہیں - اس کی وجہ بہت بعد کو مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب کہ اسلام کے وسیع مطالعہ کے بعد میں نے دوبارہ اسلام کو دریافت کیا۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اسلام کی عظمت کو الحمراء اور لال قلعہ کی سطح پہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی عظمت کے سوا کسی اور عظمت کی انھیں خبر نہیں - اگر وہ صاحب بصیرت ہوتے تو وہ جانتے کہ اسلام کی نظریاتی عظمت تمام عظمتوں سے زیادہ بڑی ہے۔ مزید یہ کہ یہ نظریاتی عظمت اس وقت بھی پوری طرح باقی رہتی ہے جب کہ در و دیوار کی عظمتیں کھنڈر ہو کر گزری ہوئی تاریخ کا حصہ بن چکی ہوں -

۲۸ نومبر کی صبح کو اٹھا تو یہ سوچ کر عجیب احساس ہوا کہ کل میں ہندستان میں سو کر اٹھا تھا۔ آج میں سو کر اٹھا ہوں تو میں ہزاروں میل دور اسپین میں ہوں - وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی - نماز میں جب میں قرآن کے ایک حصہ کی تلاوت کر رہا تھا تو غیر معمولی طور پر میری آواز اونچی ہو گئی - یہ احساس کہ آپ ایک نئی جگہ اللہ کا نام بلند کر رہے ہیں، آپ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے - آپ

زیادہ بڑھی ہوئی کیفیت کے ساتھ ذکر اور عبادت کا فعل انجام دینے لگتے ہیں۔

اسپین کے وقت میں اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس وقت جب کہ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ یہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ جب کہ اس وقت انڈیا کی گھڑیوں کی سوئی صبح چار بجے کا وقت بتا رہی ہے۔ وقت کے اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوا کہ میں ۲۷ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوا، اور اسی دن شام کو میڈرڈ پہنچ گیا۔ اگر مشارق و مغارب میں فرق نہ ہوتا اور دونوں ملکوں کی گھڑی ایک ہی ہوتی تو ۲۷ نومبر کو روانہ ہونے کے بعد جب میں یہاں پہنچتا اس وقت کلنڈر میں ۲۸ نومبر کی تاریخ شروع ہو چکی ہوتی۔

۲۷ نومبر کی شام کو جب میں کمپیوٹر کارڈ کے ذریعہ تالا کھول کر اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں کمرہ بہت شاندار نظر آیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ میڈرڈ کا ایک ممتاز ہوٹل ہے۔ لیکن اگلے ہی دن میری نظر میں اس کی جاذبیت ختم ہو چکی تھی۔ حتی کہ یہاں ٹھہرنے کا شوق کرنے کے بجائے اب میں واپسی کے دن گننے لگا۔ یہی دنیا کی تمام بظاہر عمدہ چیزوں کا حال ہے۔ دنیا کی ہر چیز ملنے کے پہلے دن اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگلے ہی دن وہ ایک معمولی چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ دور سے دیکھنے والے جس زندگی کو عیش کی زندگی سمجھتے ہیں وہ خود صاحب عیش کے لیے صرف بورڈم کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہ صرف جنّت کی خصوصیت ہے کہ اس کی جاذبیت کبھی ختم نہ ہوگی۔ بلکہ ہر دن اس کی لذت بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ دنیا میں اللہ تعالےٰ نے عمل میں لذت رکھ دی ہے اور آخرت میں عمل کے انجام میں۔

شیخ اسحاق ادریس سکوتہ کا تعلق سوڈان سے ہے۔ صبح کے ناشتہ پر ملاقات ہوئی تو ان سے میں نے مہدی سوڈانی (۱۸۸۵-۱۸۴۴ء) کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ سمجھدار آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ خود یہ بھی ایک کم عقلی کی بات ہے کہ کوئی آدمی مہدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ مگر عوام کی ایک بھیڑ ان کے گرد اکٹھا ہوگئی۔ انھوں نے ایسے اقدام کیے جن کو صرف ناپختہ اقدام ہی کہا جاسکتا ہے۔ شیخ سکوتہ نے جواب دیا: کان یری رسول اللہ کثیراً۔ ولکن مشیئۃ اللہ فوق ذلك۔ یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بہت زیادہ دیکھتے تھے۔ مگر اللہ کی مشیئت اس سے اوپر ہے۔

خواب میں کسی کو دیکھنا یہ ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کی بنا پر مہدویت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ اس طرح کے خواب کی بنیاد پر کوئی قومی یا اجتماعی پالیسی بنائی جاسکتی۔ قومی یا ملّی پالیسی

کی بنیاد شوریٰ پر ہے۔ اس طرح کے نازک معاملات میں اہل علم کے مشورہ سے جو بات طے ہوگی وہ قابل عمل ہوگی نہ کہ کسی کا یہ کہنا کہ میں نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ یہ بھی کس قدر عجیب بات ہے کہ مہدی سوڈانی پر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تقریباً ۲۲۰ سطر کا مضمون ہے اور خلیفہ دوم عمر بن خطاب پر صرف ۹ سطر کا مضمون۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، وہ کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ مگر یہ بات بھی صحیح نہیں۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یاب۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی بڑا سیاسی یا قومی کارنامہ کرے جس کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مہدی کی اصل صرف یہ ہے کہ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی حقیقت گم ہو چکی ہوگی، وہ اسلام کی معرفت حاصل کرے گا۔ گویا مہدی اصلاً ہدایت کو پانے والا ہوگا نہ کہ ہدایت کا خارجی نظام قائم کرنے والا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کا مہدی ہونا یہ اللہ کے علم کی بات ہے، اس کا یقینی علم نہ خود مہدی کو ہوگا اور نہ اس کے معاصر لوگوں کو۔ کیوں کہ ہدایت یاب کون ہے، اس کا تعلق تمام تر علمِ الٰہی سے ہے۔

۲۹ نومبر کو دوپہر کے کھانے کی میز پر قاہرہ کے دکتور جمعہ (مصری بولی میں گمعہ) بھی موجود تھے۔ گفتگو کے دوران گائے (بقرہ) کا ذکر آگیا۔ انھوں نے فوراً سورہ البقرہ کی آیتوں کی تلاوت شروع کر دی۔ سب لوگ خاموش ہو کر سننے لگے۔

مصری قاریوں کی قرأت تو مجھ کو پسند نہیں لیکن مصری علماء کی قرأت مجھ کو بہت پسند ہے۔ میں نہایت شوق کے ساتھ اس کو سنتا رہا۔ عام قاری جس طرح اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ تو مجھے بالکل غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ صحابہ اس طرح قرآن کو پڑھتے ہوں گے۔ لیکن عرب علماء خاص طور پر حجاز کے علماء کی قرأت مجھے وجدانی طور پر صحابہ کے انداز قرأت کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔ اس کو سن کر تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے زمانہ کا فاصلہ ختم ہو گیا ہے اور ہم ایک زندہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ صحابہ کی تلاوت قرآن کو دوبارہ سن رہے ہیں۔

ایک مجلس میں کچھ عرب حضرات تھے۔ ایک صاحب نے اسپین میں مسلم سلطنت کے آخری زمانہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اندلس کے آخری مسلم سلطان ابوعبداللہ نے جب الحمراء کی کنجیاں عیسائی حکمراں

کے حوالے کردیں اور وہ روتا ہوا غرناطہ سے نکلا تو اس کی ماں نے اس کی توبیخ کی اور کہا: ابك کمثل النساء ملکاضاع لم تحافظ علیہ کمثل الرجال (اس کھوئے ہوئے ملک پر عورتوں کی طرح روؤ جس کو تم مردوں کی طرح نہ بچا سکے)

میں نے کہا کہ ابوعبداللہ کی ماں کا یہ جملہ بہت زیادہ رائج ہے مگر وہ حقیقتِ حال کی صحیح ترجمانی نہیں۔ کیوں کہ ابوعبداللہ اور اس کی فوجیں آخری دور میں بھی نہایت بہادری کے ساتھ لڑی تھیں۔ مگر کوئی سلطان ایک فوج سے لڑ سکتا ہے وہ حقائق سے نہیں لڑ سکتا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ خود مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے، پھر وہ کیسے کامیاب ہوتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ابوعبداللہ نے نہایت بہادرانہ مقابلہ کر کے عیسائی فوج کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ مگر اس کے بعد ابوعبداللہ کا چچا الزغل عیسائیوں کے ساتھ مل کر اس کا داخلی دشمن بن گیا۔ اس طرح فتح دوبارہ شکست میں تبدیل ہو گئی۔

تاہم الزغل کو اس بے وفائی کا کوئی معاوضہ مسیحی حکمرانوں کی طرف سے نہیں ملا۔ سلطنت غرناطہ پر اپنے قبضہ کی تکمیل کے فوراً بعد انھوں نے الزغل کو اسپین سے نکال دیا۔ وہ الجزائر میں تلمسان کے مقام پر چلا گیا اور وہاں گم نامی کی حالت میں مر گیا۔ جو آدمی اپنوں سے بے وفائی کرے اس کو یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ غیروں کی طرف سے اس کو وفاداری کا انعام دیا جائے گا۔

اسپین کی مسلم سلطنت اپنے آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قصر الحمراء تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اسی طرح جیسے کہ ہندستان کی مغل سلطنت اپنے آخری مرحلہ میں دہلی کے لال قلعہ تک محدود ہو گئی تھی۔ مگر آخری مسلم حکمراں ابوعبداللہ کے فوجی سردار موسیٰ بن ابی الغازان نہایت بہادر تھا۔ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ اپنی موت تک بہادری کے ساتھ لڑتا رہا۔

تاہم حقیقت سے لڑنا زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے ۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو عیسائی حکمراں کے ساتھ صلح کر لی اور غرناطہ کو اس کے لیے خالی کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی عمومی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اس پکڑ دھکڑ میں شدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلیفہ کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود مسلمانوں نے ابھی اس کو قبول نہیں کیا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں بار بار انھوں نے بغاوت کا جھنڈا اٹھایا۔ مگر انھیں بری طرح شکست ہوئی اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر جنگ بندی قبول کر لی کہ وہ اسپین کو

چھوڑ کر مراکو، ترکی اور مصر چلے جائیں گے۔

تاتاری سردار ہلاکو خاں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کی مسلم سلطنت کا خاتمہ کیا تھا۔ اسپینی بادشاہ فرڈیننڈ دوم نے ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی مسلم سلطنت کو آخری طور پر ختم کر دیا۔ ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: یہ اسلام دشمنوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔

میں نے کہا کہ اگر بغداد کی عباسی سلطنت کا خاتمہ اسلام دشمنوں کی سازش کی بنا پر ہوا تو اس کے صرف پچاس سال بعد انھیں دشمنوں کا خادمانِ اسلام بن جانا کس سازش کا نتیجہ تھا۔ میں نے کہا کہ سازش کے تصور کے تحت مسلم تاریخ کی توجیہہ کرنا مسلم قوم کو مقہور، اور غیر مسلم قوم کو قاہر کے مقام پر بٹھانا ہے۔ اس طرح کا تصورِ تاریخ سراسر قرآن کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ امتِ محمدی کا مستقبل تمام تر دعوت کے اوپر منحصر ہے۔ مسلمانوں کے لیے مقدر ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کو ادا کر کے اٹھیں گے اور دعوت الی اللہ سے کوتاہی کر کے گریں گے۔ بغداد اور غرناطہ کی سلطنت کے زمانہ میں مسلمانوں نے علمی اور مادی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی۔ مگر یہ ترقیاں ان کے لیے حفاظت کا ذریعہ نہ بن سکیں۔

تاہم خود اسی المیہ میں یہ سبق بھی موجود ہے کہ عباسی خلافت کے خاتمہ کے بعد جب مسلمانوں کے پاس سیاسی اور فوجی طاقت نہ رہی تو انھوں نے اسلام کی دعوتی طاقت کو استعمال کیا۔ اور اس کے بعد تاریخ نے دیکھا کہ جہاں بظاہر کھنڈر تھا وہاں ایک شاندار قلعہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاریخ کا یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے ایک ابدی نشانِ راہ ہے۔

ایک عرب دوست نے مجھے ایک کتاب ہدیہ میں پیش کی۔ ۱۶۰ صفحہ کی یہ کتاب ۱۹۹۳ میں مکتبہ اشبیلیہ (الریاض) سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف عبد الرحمٰن عبد الوہاب ہیں اور اس کا نام ہے: تصفیۃ الوجود الاسلامی۔ یعنی اسلامی وجود کا خاتمہ۔ کتاب کے ایک حصہ میں بڑے جذباتی انداز میں سقوطِ غرناطہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے:

ھاھی الاندلس ضاعت واصبحت ذکری نبکی علی الاطلال لھا ونبکی تخاذل المسلمین ونفس یطھم فیھا (صفحہ ۱۰)	یہ ہے وہ اندلس جو کھو یا گیا اور محض ایک ایسی یاد بن کر رہ گیا جس کے کھنڈروں پر ہم روتے ہیں۔ اور جس کی حفاظت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی کوتاہی اور دستبرداری پر آنسو بہاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی مرثیہ خوانی اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام امید اور اعتماد کا دین ہے۔ اسلام عسر میں یسر کا راز بتاتا ہے۔ اسلام کے لیے خدا نے حفاظت و نصرت کا ابدی وعدہ کیا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم منفی پہلو میں بھی مثبت پہلو دریافت کریں۔ خود میڈرڈ کی موجودہ کانفرنس اس بات کی ایک علامت ہے کہ اسپین کے تاریخی کھنڈروں سے دوبارہ اسلام کا ایک نیا مستقبل پیدا ہو رہا ہے۔

کانفرنس کے شرکا، کو میڈرڈ شہر کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن کانفرنس کے اجلاس الکلا یونیورسٹی میں ہوئے جو شہر سے ۳۰ کیلو میٹر دور ہے۔ لوگ روزانہ صبح کو سواریوں کے ذریعہ یونی ورسٹی لے جائے جاتے۔ دن کے کھانے کا انتظام وہیں یونی ورسٹی کے اندر ہوتا۔ شام کا کھانا اکثر کسی اور مقام پر کسی بڑے آدمی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس طرح صبح کو نکلنے کے بعد دوبارہ رات کو ہوٹل میں واپسی ہوتی۔

۲۸ نومبر کو صبح نو بجے ہم سب لوگ قافلہ کی صورت میں الکلا یونی ورسٹی لے جائے گئے۔ یہ یونیورسٹی شہر سے دور ایک تاریخی ٹاون میں ہے۔ شہر اور اس کے بیرونی علاقہ کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم لوگ پتھر کی بنی ہوئی ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے اترے۔ اسی قدیم محل نما عمارت میں الکلا یونی ورسٹی قائم کی گئی ہے۔ اسی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام یہ کانفرنس ہو رہی ہے۔ کانفرنس کے اجلاس روزانہ اسی یونی ورسٹی کے مختلف ہال میں ہوں گے۔

میڈرڈ اسپین کی راجدھانی ہے۔ جب میں میڈرڈ کے مختلف حصوں سے گزرتا تھا تو بار بار مجھے یہ خیال آتا تھا کہ یہاں کی تمام چیزیں بظاہر یورپ کے انداز پر بنائی گئی ہیں۔ مگر وہ یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ شہروں کے معیار سے کم ہیں۔

یونی ورسٹی کے بڑے ہال میں افتتاحی اجلاس ہوا۔ بتایا گیا کہ اس کانفرنس کا مقصد تینوں مذہبوں (یہودیت، عیسائیت، اسلام) میں تعلقات کو بہتر بنانا ہے۔ اظہارِ خیال کی زبان اسپینی، انگریزی، فرانسیسی اور عربی تھی۔ ہیڈ فون کے ذریعہ ہر آدمی اپنی مطلوب زبان میں مقرر کی بات کو سن سکتا تھا۔

میڈرڈ کے میئر نے تقریر کی تو پہلے کہا ——— سلام، شولوم۔ پھر انھوں نے اپنی تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ قدیم اسپین میں تینوں مذہب کے لوگوں نے مل کر ایک تاریخ بنائی تھی۔ اب پھر ضرورت ہے کہ تینوں مذہب کے لوگ مل کر یہاں نئی دنیا کی تعمیر کریں۔

ایک اسرائیلی مقرر نے کہا کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان اقتصادی تعاون (economic cooperation) ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کے نام کو ہائی جیک کرے :

No one has right to highjack the name of God.

رات کو دوبارہ ہم لوگ اپنے ہوٹل میں واپس پہنچا دیے گئے۔

۲۸ نومبر کو افتتاحی اجلاس میں میڈرڈ کے میئر کے علاوہ ایک اسپینی یہودی اور ایک اسپینی عیسائی کی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے جن کا نام مسٹر تمارال بتایا گیا تھا۔ ان کے چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ اور بظاہر نہایت سنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد اسپینی زبان میں اپنی تقریر کی۔

ان کی شخصیت کے بارہ میں مجھے تجسس تھا۔ بعد کو ملا تو پتہ چلا کہ وہ ایک اسپینی مسلمان ہیں۔ وہ تھوڑی عربی اور تھوڑی انگریزی جانتے تھے اس لیے ان سے گفتگو ممکن ہو سکی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا اصل خاندانی نام فضل اللہ ہے۔ موجودہ نام ان کے اصل عربی نام کا اسپینی ترجمہ ہے۔ انھوں نے اپنا مکمل پتہ دیا جو اس طرح ہے :

Julio Torralbo Tamaral, Psicologia Clinia Escolar
Collegiado N. 1911 CPM, Madrid
(Tel. 96-5141433)

غرناطہ کی مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد جب اسپینی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور ان کو یہاں سے نکالا جانے لگا تو بہت سے لوگوں نے اپنے نام بدل لیے۔ تاکہ وہ یہاں رہ سکیں۔ اس طرح کے بہت سے خاندان ابھی تک اسپین میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اس لیے ایسے مسلمان اب چھپ کر نہیں رہتے۔ بلکہ وہ اعلان کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال خود فضل اللہ صاحب ہیں۔ موجودہ کانفرنس جو ایک حکومتی ادارہ کی طرف سے کی گئی تھی، اس میں ان کو اسلام کے اسپینی نمایندہ کی حیثیت سے بولنے کا موقع دیا گیا۔

کانفرنس کے موقع پر میں نے انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا : امن اسلام میں (Peace in Islam) اس کو انشاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اسلام امن کا مذہب

ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام میں جنگ صرف ناگزیر دفاع کے لیے جائز ہے، کسی اور مقصد کے لیے اسلام میں جنگ کی اجازت نہیں۔

اس پیپر کے علاوہ مختلف مواقع پر میں نے اسلام کے امن اور رحمت اور انسانیت کے تصور کی وضاحت کی۔ اس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ میڈرڈ کے اسپینی اخبار الکلا (Diario De Alcala) کا شمارہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۴ کانفرنس نمبر کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے نمایاں انداز میں صفحہ اول پر میری تنہا تصویر شائع کی۔ اخبار کا یہ شمارہ مجھے یروشلم کے آوی شاکیت (Avi Shoket) نے لاکر دیا تھا۔ یہ اور اس سلسلہ کے بعض دوسرے اسپینی اخبار اسلامی مرکز کے دفتر میں بطور ریکارڈ موجود ہیں۔

۲۹ نومبر کو میں نے اپنا جو پیپر پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ لوگوں نے نہایت دل چسپی کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے اس کی کاپیاں مانگیں۔ ایک خاتون ورکر نے مجھ سے میرا نسخہ لیا اور یونی ورسٹی کے دفتر میں جاکر اس کی کئی فوٹو کاپی نکلوائی اور لوگوں کے درمیان تقسیم کر دی۔

۲۸ نومبر کی شام کو اجلاس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد تمام شرکا یونی ورسٹی سے واپس ہوکر اپنے ہوٹل کے کمروں میں آگئے۔ اس کے بعد ۹ بجے رات کو دوبارہ کھانے کے لیے روانگی ہوئی۔ اس کا انتظام اسپین کے ایک وزیر کی طرف سے ایک خصوصی گارڈن میں کیا گیا تھا۔ یہاں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد واپسی ہوئی تو گاڑی میں ایک صاحب کا ساتھ ہوگیا۔ انھوں نے اپنا نام خواکین لومبا بتایا۔ وہ سرقسط (اسپین) کی یونی ورسٹی میں مسلم فلاسفی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مشہور مسلم فلسفی ابن باجہ کے ہم وطن ہیں اور انھوں نے ابن باجہ پر ریسرچ کر کے ایک کتاب شائع کی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے شعبہ میں کتنے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً دو سو طلبہ ہیں۔ انھوں نے اپنا نام عربی میں لکھ کر مجھے دیا۔ ان کا پورا نام اور پتہ یہ ہے:

Joaqvin Lomba, Professor of Muslim Philosophy
University of Zaragoza
50005-Zaragoza, Spain.

خواکین لومبا ابن باجہ کی بہت تعریف کرتے رہے۔ ابن باجہ (Avempace) اسپین کے شہر سرقسط (Zaragoza) میں ۱۰۹۵ء میں پیدا ہوا، اور مراکو کے شہر فاس میں ۱۱۳۹ء میں اس کی وفات

ہوئی، وہ ابن طفیل اور ابن رشد کی طرح ایک عظیم فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ اس کو ملحد قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر خواکین لومبا اسی شہر سرقسطہ میں پیدا ہوئے۔

پروفیسر خواکین لومبا عربی بھی جانتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی کے بعد اسلامی فلسفہ کی ترقی رک گئی۔ اس کے بعد کوئی بڑا مسلم فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ اس کا سبب آخر کیا ہے۔

میں نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہ دور میں تبدیلی کا معاملہ ہے۔ قدیم معنی میں جس چیز کو اسلامی فلسفہ کہا جاتا ہے، اس کی تشکیل اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دنیا میں یونان کی قیاسی منطق کا غلبہ تھا۔ مسلم فلسفیوں نے اس میں مہارت پیدا کی اور اس کی بنیاد پر اپنا فلسفہ مرتب کیا۔ مگر سائنسی انقلاب کے بعد یہ منطق ختم ہوگئی۔ اب سائنسی منطق کا دور آگیا۔ مگر مسلم ذہن سائنسی منطق میں مہارت نہ پیدا کرسکے، اس لیے وہ جدید علم کی بنیاد پر اسلامی فلسفہ (جدید علم کلام) بھی تشکیل نہ دے سکے۔

میں نے کہا کہ دور اول میں جب مسلمانوں کا مقابلہ یونانی منطق سے پیش آیا تو وہ فاتح کی نفسیات میں جی رہے تھے۔ انھوں نے بڑھ کر یونانی منطق کو سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس طرح وہ اس قابل ہو گئے کہ یونانی منطق کو اسلامائز کریں اور اس کی بنیاد پر ایک طاقت ور علم کلام پیدا کرسکیں۔

مگر موجودہ دور میں جب سائنسی منطق کا زمانہ آیا تو مسلمان دوسری قوموں کے مقابلہ میں مفتوح اور مغلوب بن چکے تھے۔ چنانچہ ان میں اقدام کے بجائے تحفظ کا مزاج پیدا ہوگیا تھا۔ اس شکست خوردہ نفسیات کی بنا پر مسلم دانشور نئے علوم کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے، وہ آگے بڑھ کر ان سے واقف ہونے اور ان کو استعمال کرنے کا حوصلہ نہ کرسکے۔

ایک مسلم اسکالر نے کہا کہ مسلم دور میں قرطبہ کی لائبریری میں چار لاکھ (400.000) کتابیں تھیں۔ جب کہ اس وقت سارے یورپ کی تمام لائبریریوں میں بھی اتنی کتابیں موجود نہیں تھیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ باتیں صرف جھوٹا فخر پیدا کرتی ہے۔ آج ضرورت یہ ہے کہ مسلمان وقت کو سمجھیں اور اپنے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے محنت کریں۔ ہمیں ماضی کے علمی کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے کہ ہم محنت کرکے آج کے علم انسانی

میں اضافہ کریں۔

اسرائیل سے بہت سے یہودی نیز عیسائی افراد یہاں آئے تھے۔ ان لوگوں سے میں معلوماتی انداز کی گفتگو کرتا رہا۔ ان میں ایک آوی شاکیت (Avi Shoket) تھے۔ ان کا تعلق فارین افیرس سے ہے۔ ان سے فلسطین کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ جب میں ان سے فلسطینیوں کے حق میں اپنے دلائل دے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہر دلیل کے جواب میں ایک متوازی دلیل ان کے پاس موجود ہے۔ میں نے سوچا کہ جب دونوں فریق یکساں طور پر اپنے آپ کو برحق سمجھ رہے ہوں تو آخر یہ مسئلہ کیوں کر حل ہو سکتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ یاسر عرفات اور حکومت اسرائیل کے درمیان حال میں جو معاہدۂ امن ہوا ہے اس کے بارہ میں اسرائیل کی اکثریت کی سوچ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں کی اکثریت خوف (fear) میں مبتلا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہم فلسطینیوں کو خاموش مدد پہنچا رہے ہیں۔ ہم نے مختلف حکومتوں کو ابھارا ہے کہ وہ فلسطینیوں کو مالی مدد دیں۔ حتی کہ ہم بالواسطہ ذرائع سے کام لے کر خود بھی فلسطینیوں کو مالی مدد دے رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسا ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ فلسطینی جب تک معاشی اعتبار سے مطمئن نہ ہوں، اس علاقہ میں امن کا قیام ممکن نہیں ہوگا۔

نادان آدمی اپنے حریف کو مار کر اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنے حریف کو خاموش کر کے اس کے اوپر فتح حاصل کر لیتا ہے۔

آوی شاکیت اسرائیلی حکومت میں اعلیٰ افسر ہیں۔ وہ شستہ انگریزی بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل عالمی برادری میں تنہائی (isolation) میں پڑ گیا تھا۔ اس تنہائی کا پہلا فائدہ ہم نے یہ اٹھایا کہ ہم یکسو ہو کر اپنی داخلی ترقی میں لگ گئے۔ مثلاً ہم نے اپنی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے پر اپنی توجہ لگا دی۔ اس خاموش جد وجہد کے نتیجہ میں ہم نے جو ترقی کی اس نے اب ہم کو اس پوزیشن تک پہنچا دیا ہے کہ ہم دنیا کی قوموں سے تعاون کر کے انھیں بہت کچھ دے سکیں۔

بنجر زمین کو کارآمد بنانے کے لیے ہمارے جو تجربات ہیں ان کی بنیاد پر ہمارے یہاں ایک مستقل شعبہ (Arid Zone Institute) قائم ہے۔ اس شعبہ کے تحت ہم مختلف ملکوں کو اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ انھیں ملکوں میں سے ایک آپ کا ملک انڈیا بھی ہے۔ انڈیا میں گجرات اور راجستھان میں ہمارے

تعاون کے تحت کئی پروجکٹ چل رہے ہیں۔

یہاں یہودی اہل علم بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ ان کی فکری سطح عام لوگوں سے اونچی ہے۔ یہی احساس مجھے ان کے بارہ میں پہلے بھی کئی بار ہوا ہے۔ شیخ ادریس سکوتہ سے میں نے کہا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودی زیادہ ذکی ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے تجربہ میں ایسا ہی پایا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک امت کی مانند رہتے ہیں۔ ان کا ایک آدمی دوسرے کے لیے اضافہ علم کا سبب بنتا ہے

(لانهم امة واحدة، يعلّم بعضهم بعضا)

یہ ایک فطری حقیقت ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے : المومن كثير باخيه۔ یعنی مومن اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کثیر ہو جاتا ہے۔ جس انسانی گروہ میں اجتماعی اوصاف نہ پائے جائیں، ان میں کا ہر شخص تنہا ہو جائے گا۔ اور جس انسانی گروہ میں اجتماعی اوصاف موجود ہوں، اس کا ہر فرد دوسروں کے لیے طاقت بنے گا اور خود دوسروں سے طاقت لیتا رہے گا۔

اسرائیل سے آئے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت کئی مسلم ملکوں میں عورت حکمراں ہے ——— ترکی، بنگلہ دیش اور پاکستان۔ روایتی اسلام میں تو عورت کی حکمرانی جائز نہیں۔ پھر یہ نیا ظاہرہ کیا اسلام میں ریفارمیشن کی علامت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال کروں گا۔ آپ کے یہاں مسز گولڈا میر حکومت کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچیں۔ ان کے دور حکومت کے بارہ میں آپ کا تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت جذباتی تھیں۔ اگر وہ حقیقت پسند ہوتیں تو فلسطینیوں سے آج امن کا جو معاہدہ ہوا ہے وہ گولڈا میر کے زمانہ میں ہی ہو گیا ہوتا، جب کہ انور سادات زندہ تھے۔ اس طرح ہم بہت سے جانی اور مالی نقصان سے بچ جاتے۔

میں نے کہا کہ خود آپ کے تجربہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو سیاسی حکمراں بنانا مفید نہیں۔ گویا کہ صحیح فطری اصول یہی ہے کہ عورت کو اقتدار اعلیٰ کے مقام پر نہ بٹھایا جائے۔ پھر جب یہ ایک صحیح فطری اصول ہے تو اس میں تبدیلی یا ریفارم کی کیا ضرورت ہے۔ اور جہاں تک بعض ملکوں میں عورت کو حکمراں بنانے کا سوال ہے تو یہ اتفاقی نوعیت کے بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے

ہے نہ کہ اسلام میں کسی ریفارمیشن کی تحریک کی وجہ سے۔

اسپین کی کانفرنس میں جو یہودی علما آئے تھے ان میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ وہ پرجوش طور پر اسپین کی ماضی کی ترقیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کا راز مجھے کسی قدر بعد کو سمجھ میں آیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ماضی میں اسپین کی ترقیوں کو یہودی تاریخ کے خانہ میں درج کر دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اُس زمانہ میں سیاسی اقتدار اگرچہ مسلمانوں کے پاس تھا۔ مگر ترقیاتی کام زیادہ تر یہودی افراد نے انجام دیا۔ یہ یہودی اس زمانہ میں ایڈوائزر، اکسپرٹ اور ماہرین فن کی صورت میں کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ابن میمون (Maimonide) اور ابن جیبرول (Gabriel) وغیرہ۔ اس لیے یہ تاریخ اگر سیاسی اعتبار سے عرب تاریخ کا حصہ ہے تو عین اسی وقت وہ علمی اعتبار سے یہودی تاریخ کا حصہ ہے۔

اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ ابن رشد کو بھی وہ یہودی عالم بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم سلطان منصور اسی لیے ابن رشد سے ناراض ہو گیا تھا اور اس کو قرطبہ سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد ابن رشد جاکر اسپین کے ایک گاؤں الیسانہ میں رہنے لگا جہاں کی آبادی میں بیشتر تعداد یہودیوں کی تھی۔ اس لیے ابن رشد یہودی تھا (فھو اذن یھودی) چنانچہ یروشلم کی ہیبرو یونی ورسٹی میں مطالعاتِ رشدی کے نام سے ایک مستقل مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کے تحت ابن رشد کی کتابیں عبرانی اور انگریزی زبان میں شائع کی جا رہی ہیں۔

میں نے کہا کہ اسپین کے ترقیاتی عمل میں خواہ کچھ یہودی افراد شریک ہوں۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ ترقیاتی عمل اسلام کے فکری انقلاب کے تحت وجود میں آیا۔ اسلام نے اس دور کے توہماتی ذہن کو اگر نہ توڑا ہوتا تو سرے سے کوئی ترقیاتی عمل ہی ظہور میں نہ آتا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین میں بہت سے اہل علم اٹھے جنھوں نے زور وشور کے ساتھ یہ بات کہی کہ مسلم عہد کے اسپین کو نظر انداز کر کے ہم نے خود اپنا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ یہ عہد پوری اسپینی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار عہد تھا۔ مزید یہ کہ اسپین کی یہی وہ علمی ترقیاں تھیں جنھوں نے یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے لیے بنیاد فراہم کی۔ اس تاریخ کو لینے کی صورت میں ہم جدید تہذیب کے معمار قرار پاتے ہیں۔ اور اس تاریخ کو چھوڑ دینے کی صورت میں ہمارے پاس کوئی چیز نہیں رہتی جس کو ہم

فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس قسم کے اسپینی اہل علم کی فہرست بہت لمبی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر گائینگوس، ڈاکٹر امریکو کاسترو، ڈاکٹر بدرو مارتینیز مونتابث وغیرہ۔

اسپین کے لوگوں کی اس کوشش کو عرب دانش وروں نے اسبنۃ التاریخ الاسلامی فی الاندلس کا نام دیا ہے۔ یعنی اندلس کی اسلامی تاریخ کو اسپینی بنانا۔ مگر خود اسپینی اس کو اپنے بھولے ہوئے ماضی کی طرف واپسی قرار دیتے ہیں۔

۲۸ نومبر کی صبح کو میں ہوٹل میں ناشتہ کی میز پر تھا۔ اچانک کسی نے میرے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔ پیچھے مڑکر دیکھا تو شیخ اسحاق ادریس سکوتہ (۵۷ سال) تھے۔ وہ ایک سوڈانی عالم ہیں اور آج کل رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ میں مقیم ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے پوچھا کہ شیخ حسن البنا تو ابتدا میں ایک مذہبی واعظ تھے اور اس اعتبار سے وہ ایک اچھا کام کر رہے تھے۔ پھر وہ غیر ضروری طور پر سیاست اور انتخابات میں کیوں کود پڑے۔ آخر انھوں نے اس بات کو کیوں نہیں جانا کہ سیاست میں داخل ہو کر وہ صرف بگاڑ میں اضافہ کریں گے، حالات کے اعتبار سے یہ ناممکن ہے کہ اس طرح وہ ملک میں کوئی مثبت سیاسی نتیجہ پیدا کر سکیں۔

شیخ سکوتہ نے جواب دیا کہ وہ ایک صوفی آدمی تھے۔ وہ سیاست نہیں جانتے تھے۔ مگر ان کے وعظوں اور تقریروں سے جب مسلمانوں کی بھیڑ ان کے گرد اکھٹا ہونے لگی تو کچھ لوگوں نے انھیں استعمال کیا (کان الشیخ حسن البنا رحمہ اللہ لیس عارفا للسیاسۃ بل کان رجلاً صوفیاً، استعملہ الذین أرادوا الحکم من خلالہ)

انھوں نے مزید کہا کہ سلفی رجحان رکھنے والے نوجوان یہ چاہتے تھے کہ اپنے انتہا پسندانہ خیالات کی تائید کے لیے وقت کی کسی مشہور و مقبول شخصیت کو اپنے نمایندہ یا ترجمان کے طور پر پیش کریں۔ اس کے لیے وہ محمد عبدہ اور رشید رضا وغیرہ کو استعمال کرنے میں ناکام رہے۔ یہاں تک کہ حسن البنا ظاہر ہوئے جو بیک وقت اہل سنت والجماعت سے بھی تعلق رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ متصوفانہ حلقوں سے بھی ان کے گہرے روابط تھے۔ چنانچہ انتہا پسند نوجوانوں کے مذکورہ طبقہ نے ان کی طرف توجہ کی اور وہ ان کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

کچھ عرب حضرات کی ایک مجلس میں یہ ذکر تھا کہ مسلمان ساری دنیا میں غیر مسلموں کے عدوان کا شکار کیوں

ہیں۔ ان لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اسپین میں مسلم اقتدار کے خاتمہ سے لے کر اب تک جتنے مصائب پیش آرہے ہیں وہ سب اعدار اسلام کی عالمی سازشوں (مؤامرات) کا نتیجہ ہیں۔ اعداء اسلام متحد ہوکر اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں، صدیوں سے پیش آنے والے تمام الم ناک واقعات اسی سازش کے مختلف مظاہر ہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کے پاس ان مخالفانہ واقعات کی توجیہہ کے لیے ایک ہی لفظ ہے، اور وہ مؤامرات اعدار ہے۔ مگر یہ توجیہہ کتاب اللہ کی نفی کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں باربار مختلف الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ اہل اسلام کا ولی و کارساز ہے۔ دنیا میں ان کے معاملہ کو خدا نے اتنا زیادہ مستحکم کر دیا ہے کہ اب انھیں انسانوں سے نہیں ڈرنا ہے بلکہ صرف خدا سے ڈرنا ہے۔ مگر آپ لوگ اور مسلم دنیا کے دوسرے علمار جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاملاتِ دنیا کی باگ ڈور تمام تر صرف اعدار اسلام کے ہاتھ میں ہے، اور خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ تاریخ کا یہ تصور سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں انسان ایک دوسرے کے عدو (دشمن) رہیں گے۔ یہاں عداوت سے مراد تحدی ہے۔ یعنی انسان ایک دوسرے کے لیے چیلنج بنیں گے۔ تحدیات (چیلنج) کے زینوں کو طے کرتی ہوئی انسانی تاریخ اپنا ترقی کا سفر کرے گی۔ دنیا میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو آپ فطرت کے اسی قانون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

میں نے کہا کہ مخالفانہ واقعات کے وجود سے مجھے انکار نہیں۔ مگر آپ کو چاہیے کہ ان واقعات کی توجیہہ آپ مؤامرات کے تصور سے نہ کریں بلکہ تحدیات کے تصور سے کریں۔ یہ تحدیات کسی مفروضہ دشمنِ اسلام کی گھڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خود خالق کائنات کا مقرر کردہ نظام ہی ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم ان تحدیات کا سامنا کریں۔ فریاد اور احتجاج سے ہمیں کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔

۲۸ نومبر کی شام کو کھانے کی میز پر ایک اسپینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ برشلونہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Migule De Quadras Sans
Ronda General Thitre, 165-6
08022 Barcelona, Spain. (Tel. 34-3-4174160)

انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ہندستان کے مختلف شہروں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے ہندو سادھوؤں اور سنتوں اور ہندوؤں کی مذہبی تنظیموں کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا کہ میں سمجھا کہ شاید وہ ہندو یا بدھسٹ ہیں۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک عیسائی ہیں۔ البتہ ہندو فلسفہ سے انھیں دل چسپی ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ ہندستان بھی گئے۔

اسی میز پر ایک اور شخص بالکل عربوں کی طرح عربی زبان بول رہے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی مسلمان ہیں۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہ عیسائی تھے۔ اس طرح کے ہزاروں عیسائی مختلف مذاہب کے تقریبی مطالعہ کے لیے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر مذہب کی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کلچرل طور پر ان سے مماثلت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسلمانوں میں ایسی لگن والے لوگ نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کا مذہب ان کے لیے دنیوی انٹرسٹ بن چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہی چیز آخرت کے انٹرسٹ کی خاطر ہو سکتی تھی۔ مگر آخرت کے انٹرسٹ میں لوگوں کے لیے اتنی کشش نہیں کہ وہ اس درجہ لگن کے ساتھ اس کے لیے کام کر سکیں۔

ایک عرب عالم نے اپنی تقریر میں شام و فلسطین کے تاریخی مقامات کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا: ھذہ الاماکن ملیئۃ بالرموز المقدسۃ۔ عام اُردو داں اس جملہ کو سنے تو شاید وہ سمجھے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اسرار سے بھرے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ مقامات مقدس نشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رمز (جمع رموز) کا لفظ عربی میں علامت یا نشانی کے لیے ہے مگر اُردو میں اس کو راز کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ایک ہی لفظ عربی میں کچھ معنی میں ہے اور اردو میں کچھ معنی میں۔ زبانوں میں اس طرح کی توسیع عام ہے۔ ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں کبھی سابق مفہوم ہی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی بدلے ہوئے مفہوم میں۔

ایک مسیحی مقرر نے کہا کہ ہمارے اندر سلف کرٹسزم کی جرأت ہونی چاہیے۔ لوگ سلف کرٹسزم سے اس لیے گھبراتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم اپنی نفی کرنے لگیں گے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ہم کو غیر یہودی اور غیر اسلامی اور غیر مسیحی بننا پڑے گا۔ تب صحیح ڈائیلاگ ہوگا:

If you want to start real dialogue, first you have to dejudise yourself, de Islamise yourself, de Chrischianise yourself.

یں نے کہا کہ کرٹسزم تو ٹھیک ہے۔ مگر ریل ڈائیلاگ کی یہ شرط صحیح نہیں کہ ہر آدمی پہلے اپنی حیثیت کا خاتمہ کرے۔ اس کی صحیح شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ذوق ہو۔ وہ کھلے ذہن کے ساتھ ایک دوسرے کی بات کو سنے اور تعصب کے بجائے دلائل کی بنیاد پر اپنے رویہ کا فیصلہ کرے۔

اس کانفرنس میں بہت سے عرب شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک، نومولود حکومت فلسطین کے سفیر نبیل معروف بھی تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ پوری امت کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم امت کی طرف سے مدد کے منتظر ہیں (نحن منتظروالغيث من الامة) میں نے ان کا پتہ لکھتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ اپنی حکومت کو دولتِ فلسطینیہ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، ہم اس وقت اسی کے راستہ میں ہیں (نحن على الطريق)

وہ یہاں کی تقریروں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اس یہودی عالم کی تقریر سے بھی خوش نہیں تھے جس نے کہا تھا کہ عرب اور اسرائیل کے درمیان اقتصادی تعاون (economic cooperation) کا بہت وسیع میدان ہے اور دونوں کو سیاسی ٹکراؤ کو چھوڑ کر اقتصادی ترقی کے مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

اجلاس کے ختم پر ہم لوگ باہر نکلے تو ایک آدمی شیخ ادریس سکوتہ سے بہت تپاک کے ساتھ ملا۔ دونوں بہت زیادہ بے تکلفی سے عربی میں بات کرنے لگے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی عرب مسلمان ہیں۔ اتنے میں ایک اخبار کا رپورٹر آگیا۔ اس نے ہم تینوں کا تعارف جاننا چاہا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ صاحب اسرائیل کے ایک یہودی تھے۔

یہاں یہودی بڑی تعداد میں آئے تھے۔ یہودی آج کل بڑے پیمانہ پر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہودیوں اور مسلمانوں کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ دونوں اپنے ملے ہوئے پر مطمئن ہو کر باہم اچھے تعلقات قائم کر لیں۔ مگر مجھ کو یہاں آئے ہوئے مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں ملا جو دل سے اس نظریہ کا حامی ہو۔

دکتورہ بنت الشاطیٔ مصر کی مشہور خاتون ادیب ہیں۔ وہ بھی اس کانفرنس میں آئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ سراپا احتجاج بنی ہوئی ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے پرجوش انداز میں کہا کہ یہ ڈائیلاگ نہیں ہے، یہ سب کلنٹن کے اشارہ پر ہو رہا ہے۔ امریکہ نے ہم لوگوں کو مفلس بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس پر بھی احتجاج کیا کہ تقریریں زیادہ ہو رہی ہیں مگر مناقشہ کا وقت کم دیا جا رہا ہے (تتمرجلسة بعد جلسة بدون مناقشة، ماهذا)

وہ کبھی عربی میں بولتی تھیں اور کبھی انگریزی میں۔ ایک بار انھوں نے امریکہ کے خلاف جذباتی انداز میں بولتے ہوئے کہا کہ ہم غلام ہیں، ہم امریکہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے :

We are slave, we can't live without America.

میں نے کہا کہ خاتون محترم، اگر صورت حال بالفرض وہی ہے جو آپ بتاتی ہیں تب بھی یہاں لفظی احتجاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنی کمیوں کو دور کرنا ہے، اس کے بعد ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دوسری قوموں کی زیادتی سے محفوظ رہ سکیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اسلام میں جن باتوں کی تعلیم دی گئی ہے ان میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو توبہ کہا جاتا ہے۔ یعنی غلطی کرنے کے بعد دوبارہ درست طریقہ کی طرف واپس آنا۔ یہ توبہ اسلامی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے۔ جس آدمی کے اندر توبہ کا مزاج نہ ہو وہ کبھی ایمان و اسلام میں ترقی نہیں کر سکتا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح کا معاملہ توبہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے (القصص ٦٧) توبہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ جو آدمی غلطی کرنے کے بعد سچی توبہ کرے اور اس کی شرطوں کو پورا کرے تو اس نے توبہ سے پہلے جو برائی کی تھی اس کو بھی بھلائی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے (الفرقان ٧٠)

میں نے کہا کہ مسلمان توبہ کے اس حکم کو چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو جانتے ہیں مگر وہ بڑے بڑے معاملات میں اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں جس سب سے بڑی غلطی میں مبتلا ہیں وہ دوسری قوموں سے ٹکراؤ کی پالیسی ہے۔ یہ ٹکراؤ اللہ کی نظر میں جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ٹکراؤ سے یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ اس ٹکراؤ سے مسلمانوں کو نہیں ملا۔

غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے لیے مدعو قوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قوموں کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ انھیں خدا کی تعلیمات سے باخبر کیا جائے۔ ہر قسم کے بہترین ذرائع کو استعمال کر کے ان لوگوں تک دین حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ پیغام رسانی کے اس عمل کو معتدل انداز میں جاری رکھنے کے لیے یہ بھی مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ ان قوموں کی زیادتی کو برداشت کریں، وہ ان کی اشتعال انگیزی کے باوجود ان کے خیر خواہ بنے رہیں۔

مگر مسلم لیڈروں نے غیر مسلم قوموں کی بعض زیادتیوں پر بے برداشت ہوکر ان کے خلاف ٹکراؤ شروع کر رکھا ہے۔ اس ٹکراؤ کو وہ بطور خود جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاد نہیں ہے بلکہ سرکشی ہے۔ مسلم لیڈروں کو اس سرکشی سے توبہ کرنا ہے۔ انھیں ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر نرمی اور محبت کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یہ توبہ ہے اور وہ مسلم لیڈروں کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے۔ اگر انھوں نے یہ توبہ نہ کی اور مدعو قوموں سے موجودہ ٹکراؤ کی پالیسی کو انھوں نے جاری رکھا تو یقینی طور پر وہ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بن کر رہ جائیں گے۔ اور ذلت اور ناکامی کے سوا کچھ بھی انھیں حاصل نہ ہوگا۔

حسب معمول ۲۹ نومبر کی صبح کو تمام لوگ گاڑیوں کے ذریعہ ہوٹل سے یونی ورسٹی لے جائے گئے۔ راستہ میں مختلف قسم کے اسپینی مناظر سامنے آتے رہے۔ یہ علاقہ پہلے مسلم اسپین میں شامل تھا جس کو اب ایبریا (Iberia) کہا جاتا ہے۔

یونی ورسٹی میں ایک صاحب پر تپاک طور پر ملے۔ انھوں نے کہا السلام علیکم۔ وہ عربی زبان میں بول رہے تھے۔ انھوں نے اپنا نام فادر جیری بیکر بتایا۔ ان کے چہرہ پر مسلمانوں جیسی سفید داڑھی تھی۔ وہ فرانس میں پیدا ہوئے۔ عرصہ سے وہ الجیریا میں مشنری کے طور پر کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ الجزائر کے مستقبل کے بارہ میں آپ کا اندازہ کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں جواب دیا کہ امن ابھی قریب نظر نہیں آتا :

Peace is not very near.

ایک یہودی جن کا نام موریس رومانی بتایا گیا تھا۔ انھوں نے صبح کے اجلاس میں بولتے ہوئے کہا کہ اسپین کی قدیم تاریخ مسلم۔ کرسچین۔ یہودی کے کوآرڈی نیشن کی شاندار مثال ہے۔ اسی کوآرڈی نیشن نے اسپین کا گولڈن ایج پیدا کیا تھا۔ اس زمانہ میں عربی زبان کا عام رواج تھا۔ اس زمانہ میں کرسچین، یہودی اور مسلمان آزادانہ طور پر آپس میں عربی میں بات کرتے تھے۔ اب ہم کو دوبارہ اسی کوآرڈی نیشن کی ضرورت ہے۔

۲۹ نومبر کی شام کو آخری اجلاس تھا۔ اس میں اسپین کے کنگ اور کوئن دونوں شریک ہوئے۔ ہال کے اندر دونوں بالکل سادہ انداز میں داخل ہوئے۔ دونوں معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر ان کے لیے کوئی خصوصی کرسی بھی نہیں رکھی گئی۔ میری نشست ان کے بہت قریب تھی، اس لیے

میں دونوں کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ دونوں اتنے زیادہ سادہ اور متواضع معلوم ہورہے تھے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس ملک کے بادشاہ ہیں۔

کنگ نے اپنی اسپینی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ ٹالرنس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں یہودی آئے۔ عیسائی آئے۔ مسلمان آئے۔ سب مل جل کر ٹالرنس کے ساتھ یہاں رہے، سب نے ملک کی ترقی میں حصہ لیا۔ یہی ماحول ہم کو نئے اسپین میں بنانا ہے۔ یہی ہمارے لیے ترقی کا واحد راستہ ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارے ملک میں ہر مذہب کو یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ ہر مذہب کو اپنے اپنے دائرہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔

شاہ اسپین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس ملک کی جدید تاریخ میں افغانستان جیسے مسلم ملکوں کے لیے ایک بڑی سبق آموز مثال ہے۔ جنرل فرینکو (Francisco Franco) نے فوجی بغاوت کر کے یہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ۱۹۳۶ میں اسپین کے مطلق حکمراں بن گئے۔ لیکن بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر ۱۹۷۳ میں انھوں نے وزیر اعظم کے عہدہ سے استعفا دے دیا۔

جنرل فرینکو کا ایک بیٹا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے بیٹے کے بجائے جان کارلوز (Juan Carlos) کو ۱۹۶۹ میں اپنا جانشین مقرر کر دیا جو قدیم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے مطابق، ۲۰ نومبر ۱۹۷۵ کو جب جنرل فرینکو کی موت ہوئی تو فوراً ہی جان کارلوز اسپین کے کنگ بن گئے (17/442-43)

افغانستان میں روسی فوج کی واپسی (۱۹۸۶) یا ڈاکٹر نجیب اللہ خاں کے خاتمہ (۱۹۹۲) کے بعد اگر ایسا ہوتا کہ افغانی لیڈر ظاہر شاہ کو روم سے واپس بلا کر انھیں دوبارہ علامتی بادشاہ کے طور پر کابل کے شاہی محل میں رکھ دیتے اور ان کے رسمی اقتدار کے تحت الکشن کر کے حکومت بناتے تو یہ افغانستان کے حق میں بے حد مفید ہوتا۔ اس کے بعد فوراً افغانستان کو اتحاد اور سیاسی استحکام حاصل ہو جاتا اور افغانیوں کی طاقت جو برسوں سے باہمی جنگ میں برباد ہو رہی ہے وہ محفوظ رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی میں استعمال ہونے لگتی، جیسا کہ آج اسپین میں ہے۔

جنرل فرانکو اگرچہ ایک ڈکٹیٹر آدمی تھا۔ مگر آخر عمر میں وہ معتدل ہو گیا تھا۔ اس نے حکومت کی پوری پالیسی میں سختی کے بجائے نرمی کا انداز اختیار کیا۔ استعماری دور کی باقیات کے طور پر افریقہ کے کئی علاقے اسپین کے قبضہ میں تھے۔ اسپین کی نئی حکومتی پالیسی کے تحت ان کو آزاد کر دیا گیا۔ افریقہ کے اسپینی صحارا

کو مراکو اور موریطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ مراکو کے بعض ساحلی علاقے اسپین کے قبضہ میں تھے۔ مثلاً
اِفنی (Ifni) اور سبتہ (Ceuta) ۔ ۱۹۷۰ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ
کے تحت اِفنی مُراکو کو مل گیا اور سبطہ بدستور اسپین کے پاس باقی رہا (12/444)

یہاں جنرل فرانکو (۱۹۷۵ - ۱۸۹۲) کی پانچ تصویریں دی جارہی ہیں۔ یہ نوجوانی کی عمر سے لے
کر بڑھاپے کی عمر تک کی ہیں۔ یہ تصویریں بڑی عبرت ناک ہیں۔ یہ بتاتی ہیں کہ کس طرح آدمی طاقت سے
آغاز کرکے آخر کار ضعف کی حالت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ تصویریں گویا قرآن کی اس آیت کی زندہ
تفسیر ہیں کہ ——— اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا۔ پھر ناتوانی کے بعد قوت دی۔ پھر قوت کے
بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علیم وقدیر ہے (الروم ۵۴)

میڈرڈ کی کانفرنس میں میری ملاقات سبتہ کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کا نام محمد علی البھلولی (۴۱ سال)
تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اسپین اور مراکو کے درمیان مذکورہ معاہدہ کے بعد اسپین میں مسلمانوں کے حالات
بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اب یہاں تعصب کے بجائے رواداری آگئی ہے۔ ممکن ہے کہ اندر اندر کچھ تعصب
موجود ہو، مگر ظاہری طور پر ہم لوگوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی مشکل کا سامنا پیش نہیں آرہا ہے۔

Generalissimo Francisco Franco in uniforms he wore as a cadet at infantry school at Toledo, Spain, around 1910, as a general in 1937 during the Spanish civil war, as head of Falange Party in 1945 and in 1962 when he celebrated his 70th birthday. He died in 1975.

گویا سبتہ پر جزئی مفاہمت کرنے کی بنا پر پورے ملک اسپین میں مسلمانوں کو کلی مواقع حاصل ہو گئے۔

محمد علی البھلولی نے ۲۹ نومبر کی ملاقات میں بتایا کہ وہ سبتہ میں پیدا ہوئے۔ وہ یہاں تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے عربی میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۹۲ میں اسپین کی مسلم تنظیموں اور حکومت اسپین کے درمیان معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت اسپینی حکومت نے دینِ اسلام کو ملک کا ایک مذہب تسلیم کر لیا (تم الاعتراف بالدین الاسلامی من طرف الحکومة الاسبانیة بعد توقیع اتفاقیة بین اللجنة الاسلامیة الاسبانیة والحکومة)

انھوں نے بتایا کہ اس وقت اسپین میں پانچ لاکھ (500,000) مسلمان موجود ہیں۔ سبتہ میں مسلمانوں کی تعداد پچیس ہزار ہے اور ملیلہ میں ۳۵ ہزار۔ سبتہ میں سولہ مسجدیں ہیں۔ اسپینی زبان پر ابھی تک عربی کے اثرات ہیں۔ عربی کے بہت سے الفاظ اسپینی زبان میں پائے جاتے ہیں مثلاً القنطرہ (Alcantara) القلعہ (Alcala) وغیرہ۔

سبتہ اور جبل الطارق کے درمیان صرف ۲۳ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ پرتگالیوں نے سبتہ پر ۱۴۱۵ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کئی بار سبتہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ ۱۴۸۰ء میں اسپین نے پرتگالیوں کو شکست دے کر سبتہ اور بعض دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے سبتہ اور ملیلہ اسپین کے قبضہ میں ہے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے سبتہ اور ملیلہ کا ذکر کیا۔ دوسرے نے کہا کہ ہمارا ان سے کیا تعلق، وہ دونوں تو اسپین کے شہر ہیں (ما شاننا بهما، انهما مدينتان اسبانيتان) پہلے نے کہا کہ یہ کیسی عجیب بے خبری ہے کہ عرب یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ دونوں مراکو کے ساحلی شہر ہیں۔ انھوں نے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ یہ صرف مراکو کی نہیں بلکہ تمام دول عربیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ انھیں واپس لے۔ مگر یہ نہایت عجیب بات ہے کہ عربوں کی تمام چوٹی کانفرنسوں نے سبتہ اور ملیلہ پر کبھی سرے سے بحث ہی نہ کی (من الغريب ان كافة مؤتمرات القمة العربية لم تتحدث مطلقا عن سبتة ومليلة)

میں نے کہا کہ اگر عرب سلطنتوں نے اس مسئلہ پر کوئی اقدام نہیں کیا تو آپ نے خود ہی ان کی آزادی کے لیے اقدام کر دیا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص ایک ملک سے کیوں کر لڑ سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی سوال عرب سلطنتوں کی راہ میں بھی حائل ہے۔ کیوں کہ اگر انھوں نے اس موضوع پر کوئی اقدام کیا تو پورا

یورپ اور اقوام متحدہ ان کے مقابل میں آجائیں گے، اس معاملہ میں جو عذر آپ کے لیے ہے وہی عذر ان کے لیے بھی ہے۔

جس طرح اسپین کے مقابلہ میں مراکو کے لیے سبتہ کا مسئلہ ہے، اسی طرح خود اسپین کے لیے برطانیہ کے مقابلہ میں جبرالٹر کا مسئلہ ہے۔ جبرالٹر جغرافی طور پر اسپین کا حصہ ہے، مگر ابھی تک اس کے اوپر برطانیہ کا قبضہ باقی ہے۔

(المجلۃ (جدہ) کے شمارہ ۱۳-۱۹ نومبر ۱۹۹۴ (۱۰-۱۶ جمادی الآخرۃ ۱۴۱۵ھ) میں مراکو کے الملک الحسن الثانی کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس سلسلہ میں مجلہ کے رئیس التحریر عبد الرحمٰن حمد الراشد نے ان سے ملاقات کی تھی۔ شاہ حسن نے عرب لیگ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا :

کیا ہم عرب لیگ کو قبر میں دفن کر دیں۔ اور اس کا جنازہ کس طرح نکلے گا۔ شاہ نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم صرف میثاق کی تبدیلی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم نئی عرب لیگ کے بارہ میں سوچیں۔ کیوں۔ اس لیے کہ عرب لیگ اب تک عرب۔ اسرائیل اختلاف کی بنا پر قائم تھی۔ یہی اختلاف اس کو غذا پہنچاتا تھا اور اس کو آکسیجن دیتا تھا۔ اور جب بھی وہ کمزور ہوتا تھا تو وہ اس کو طاقت کا انجکشن دیتا تھا۔ آج یہ عرب۔ اسرائیلی اختلاف کمزور ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے چاہا تو وہ ختم ہونے والا ہے۔ اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اس گھر سے وابستہ رہیں جس کو ہم عرب لیگ کہتے ہیں۔ تاکہ ہماری اجتماعیت قائم ہو سکے۔ شاہ نے اختصار کے ساتھ اس کو اس طرح کہا : ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم عرب لیگ کے لیے ایک نئے فکر کو ظہور میں لائیں :

هل سنقبر الجامعة العربية و كيف ستكون جنازتها؟ سأل الملك نفسه وأجاب بنفسه قائلاً: "اقول يجب ان لا نكتفي بتغيير الميثاق، يجب ان نفكر في جامعة عربية جديدة، لماذا؟ لان الجامعة العربية الى حد الآن كانت موجودة بسبب الخلاف العربي – الاسرائيلي، وكان ذلك الخلاف يغذيها ويعطيها الاوكسجين ويعطيها حقناً كلما ضعفت. اليوم هذا الخلاف اصبح يضعف ريثما ينتهي ان شاء الله... علينا اذن ان نبقى متشبثين بهذا البيت الذي نسميه الجامعة العربية ليجمع شملنا". قالها باختصار، "علينا ان نبلور فكرة جديدة للجامعة"

ایک صاحب سے اس کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ عرب لیگ کی حیثیت صرف ایک رسمی مجلس کی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کسی موثر اتحاد کی۔ پھر جن عرب ملکوں کا حال یہ ہو کہ عرب لیگ جیسا رسمی اتحاد قائم کرنے کے لیے بھی انھیں ایک بیرونی قومی خطرہ کی ضرورت ہو، ان سے کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اسپین کے مقابلہ میں کوئی بڑا اور فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔

میرے کمرہ میں ایک اچھا ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ مگر اپنے مزاج کے مطابق، میں نے کبھی اس کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ۲۹ نومبر کی صبح کو وقت جاننے کے لیے اس کو کھولا تو اسپینی زبان میں خبریں آرہی تھیں۔ خبریں تو سمجھ میں نہ آئیں۔ البتہ یہ سنا کہ اناؤنسر بار بار "مسلمان" کا لفظ بول رہا ہے۔ اناؤنسر نے بوسنیا کے بارہ میں کوئی خبر بتائی۔ اسی کے دوران اس نے غالباً بوسنیا کے کسی مسلم لیڈر کا ایک قول انگریزی میں نقل کیا۔ کہنے والے نے کہا تھا کہ بوسنیا کی صورت حال کے لیے میں اقوام متحدہ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ وہ ضروری کارروائی کرنے میں ناکام رہی :

I blame the U.N. for the Bosnian situation. It failed to act.

یہ یقینی طور پر نادانی کا ایک جملہ تھا۔ اقوام متحدہ نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ قومی نزاعات پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے، بلکہ صرف پر امن دائرہ میں رہتے ہوئے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا حال یہ ہے کہ پہلے وہ اقوام متحدہ کے اصول کی خلاف ورزی کرکے گن اٹھائیں گے اور جب اس کا الٹا انجام سامنے آئے گا تو اقوام متحدہ سے امید کریں گے کہ وہ آئے اور ان کی مرضی کے مطابق ان کے مسئلہ کو حل کر دے۔

۲۹ نومبر کو صبح ۷ بجے میرے کمرہ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو تکرار کے ساتھ یہ آواز آنے لگی کہ صباح الخیر، یہ بیدار کرنے کی کال ہے :

Good morning. This is a wake-up call.

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے حشر کا لمحہ آگیا ہے اور موت کی نیند سونے والی روحوں کو پکارا جا رہا ہے کہ اٹھ جاؤ۔ اب آخری فیصلہ کا وقت آگیا۔ یہ وقت آج علامتی صورت میں آیا ہے، مگر کل وہ حقیقی صورت میں آئے گا۔ عقل مند وہ ہے جو کل ہونے والے اعلان کو آج کی آواز میں سن لے۔

کھانے کی میز پر دو مصری نوجوان آ گئے۔ ایک کا نام عبد المقصود تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈیوزبری

(انگلینڈ) میں تبلیغی جماعت کا اجتماع تھا۔ اس میں وہ بھی جزئی طور پر شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں ہر ملک کے مسلمان آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف السلام علیکم، السلام علیکم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہی منظر تھا جس کو قرآن میں اِلَّا قِیلاً سلاماً سلاماً (الواقعہ ۲۶) کہا گیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں نے آخری تقریر سنی، بہت بہترین تقریر تھی۔ ایسی تقریر میں نے مصر میں کبھی نہیں سنی (کلام جمیل، لم اسمع مثلہ فی مصر)

کھانے کی میز پر قاہرہ کے دکتور جمعہ بھی موجود تھے۔ وہ فقہ کے استاد ہیں۔ ایک مقامی مسلمان نے ان سے سوال کیا کہ اس ملک میں حلال گوشت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پھر ہم لوگ کیا کریں۔ دکتور جمعہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو دیکھو۔ یہ گوشت نہیں کھاتے۔ وہ غیر لحمی غذا پر گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی صحت بہترین ہے۔ گوشت کے بغیر آدمی مر نہیں جاتا۔

گوشت کے بارہ میں میرا یہ ذوق اختیاری نہیں ہے۔ میری والدہ کہتی تھیں کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا اس وقت بھی میرا یہ حال تھا کہ اگر وہ انڈا یا مچھلی یا گوشت میرے منہ میں ڈالتی تھیں تو میں نکال دیتا تھا، اور اس کو کھاتا نہیں تھا۔ گویا میں پیدائشی طور پر "سبزی خور" ہوں۔ میں نے دکتور جمعہ کی بات کی تکمیل کرتے ہوئے کہا: میں بائی برتھ ویجیٹیرین ہوں، آپ حالات کے تقاضے کے تحت بائی چوائس ویجیٹیرین بن جائیے۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ جو عرب خود اپنے وطن میں کوئی بڑا علمی کارنامہ نہیں کر سکے تھے انھوں نے اسپین میں کیسے اتنا بڑا علمی کارنامہ انجام دیا کہ وہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد بن گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا جواب ایک مستشرق نے یہ دیا ہے کہ عرب ایک ایسے ملک میں تھے جہاں دریاؤں کی روانی نہ تھی۔ وہاں سرسبز مناظر موجود نہ تھے۔ اس کے بجائے وہاں خشک پہاڑ اور تپتے ہوئے ریگستانوں کا ماحول تھا۔ اس کے بعد یہ عرب اپنے وطن سے نکل کر جب اسپین میں پہنچے تو یہاں قدرتی مناظر تھے۔ فطرت کا حسن تھا، نشاط انگیز آب و ہوا تھی۔ اس نے عربوں کے اندر ولولۂ کار اور جوش عمل ابھار دیا۔ ماحول کے اثر سے ان کی فطری صلاحیتیں جاگ اٹھیں۔

میں نے کہا کہ یہاں دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان نشاط انگیز مناظر نے خود اسپینیوں کے اندر یہی ولولہ کیوں نہیں ابھارا۔ اس فرق پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ولولۂ کار کو ابھارنے والی اصل چیز تبدیلی (change) ہے۔ عربوں کے لیے صحرا سے نکل کر چمنستان میں جانا تبدیلی کا ایک

ہیجان خیز معاملہ تھا۔ اس تجربہ نے ان کی شخصیت کو جگا دیا۔ مگر یہی عرب جب اسپین کے محل اور باغات کے عادی ہو گئے تو دوبارہ ان کی صلاحیتیں سو گئیں۔ علم کے قافلہ کو مزید آگے لے جانے کا کام مغربی یورپ نے کیا جس کو دو سو سالہ کروسیڈ کی ہار نے تبدیلی کے زلزلہ خیز تجربہ سے دوچار کر دیا تھا۔

ایک اسپینی اسکالر نے کہا کہ مسلمانوں نے جب ہمارے ملک پر حملہ کیا تو انھوں نے ہماری دولت کو لوٹا، یہاں کے باشندوں کو لونڈی اور غلام بنایا۔ کیا آپ کا اسلام اسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسپین میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک طبقہ اسی انداز میں سوچتا ہے۔

جہاں تک اسپین میں مسلمانوں کی فوجی کارروائی کا تعلق ہے، اس کا معقول جواز موجود ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانہ میں وِسی گوتھ کا آخری بادشاہ وٹیزا (Witiza) اسپین کا حکمراں تھا۔ اس کا زمانۂ حکومت ۷۰۰ سے ۷۱۰ تک ہے۔ پادریوں نے وٹیزا کے خلاف سازش کر کے اس کو تخت سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ ایک فوجی سردار لذریق (Roderick) کو اسپین کے تخت پر بٹھا دیا۔ وٹیزا چونکہ لذریق کو غاصب سمجھتا تھا۔ اس نے اس سے انتقام لینے کے لیے مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کی دعوت دی۔ اس حملہ میں سبتہ (Ceuta) کے ناراض اسپینی حاکم (Count of Ceuta) نے بھی مدد کی جس کا نام جولین (Julian) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جولین نے طارق کو چار بڑی کشتیاں دی تھیں جن کے ذریعہ طارق نے اپنے لشکر کو اسپین کے ساحل پر اتارا تھا۔

مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ اپنی طرف سے شروع نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ خود اسپین کے وِسی گوتھ کی دعوت پر تھا :

> The Muslim invasion of Spain was the result of Visigoth invitation rather than Muslim initiative. (17/414)

مگر اسی کے ساتھ خود مسلم مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نُصیر نے جب اسپین میں فتوحات کیں تو وہاں انھوں نے بے شمار مقدار میں سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہر اور دوسرے اموال کو لوٹا اور کثیر تعداد میں عورتوں اور لڑکوں کو لونڈی اور غلام بنایا (۸۳)۔ وہ ایک ایک شہر کو فتح کرتے رہے اور لونڈی اور غلام اور مال غنیمت اتنی زیادہ مقدار میں لے کر لوٹے جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا (لا تُحصی ولا تُعدّ کثرة) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۹/۸۷

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے اس طرح اسپین میں مال غنیمت لوٹنا اور لونڈی اور غلام بنانا صحیح نہ تھا۔ کیوں کہ مال غنیمت کا اسلامی قانون اس جنگ کے لیے ہے جو کسی قوم نے یک طرفہ جارحیت کر کے مسلمانوں کے خلاف چھیڑی ہو۔ مگر اسپین کے لوگ اس معنی میں جارح نہ تھے۔ اس لیے فتح کے بعد ان کے اموال کو لوٹنا اور ان کو لونڈی اور غلام بنانا صحیح نہیں ہو سکتا۔ مزید یہ کہ مال غنیمت کا قانون بھی صرف میدان جنگ کے لیے ہے نہ کہ عام آبادی کے لیے۔

ایک اور صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ طارق بن زیاد یا بابر کے معاملہ کو عام طور پر اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "طارق کا حملہ اسپین پر" یا "بابر کا حملہ ہندستان پر"۔ مگر یہ درست نہیں۔ یہ شاہی دور کے واقعہ کو جمہوری دور کی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ آج قومی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ آج ایک قوم یا ملک کا حملہ دوسری قوم یا ملک پر ہوتا ہے۔ مگر شاہی دور میں ایسا نہ تھا۔ اس زمانہ میں جو سیاسی ٹکراؤ پیش آتا تھا وہ ایک بادشاہ کا دوسرے بادشاہ سے ہوتا تھا نہ کہ ایک قوم کا دوسری قوم سے۔

اسپین میں طارق بن زیاد کے داخلہ کو اسی زمانی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ مزید یہ کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ معروف معنوں میں کوئی جارحانہ داخلہ نہ تھا بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ سابق حکمراں کے ظلم سے لوگ تنگ آ گئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے سابق حکمراں کے خلاف نئے حکمراں کو دعوت دی اور اس کا استقبال کیا۔

۲۹ نومبر کو میڈرڈ کے اخبار (Puerta de Madrid) کی خاتون نمائندہ لوئیلا (Leoilla) نے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام کی تعلیمات فطرت پر مبنی ہیں۔ اور فطرت ہمیشہ امن کو پسند کرتی ہے۔ اس لیے اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں۔

اسی طرح ایک اور اسپینی اخبار (La Libre Belgique) کی خاتون نمائندہ پاسکل بورگا (Pascale Bourgaux) نے اپنے اخبار کے لیے انٹرویو لیا۔ ان کو میں نے اپنے پمفلٹ "پیس ان اسلام" کی ایک کاپی دی۔ ان کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ قسم کی کانفرنس کو صرف اس کے تین روزہ اجلاس کی روشنی میں نہیں جانچنا چاہیے بلکہ اس کو ایک عمل (Process) کے روپ

یں دیکھنا چاہیے۔ اسی وقت اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان سے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری آئے تھے۔ وہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (اسلام آباد) کے ڈائرکٹر ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پاکستان میں ایک بڑی تباہ کن سیاسی روایت جاری ہوگئی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو پارٹی الکشن میں ہارتی ہے وہ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتی۔ پولنگ بوتھ پر ناکامی کے بعد وہ دوبارہ سڑک کی سیاست پر آجاتی ہے۔ وہ جلسہ جلوس، حتی کہ توڑ پھوڑ کے ہنگامے جاری کرکے چاہتی ہے کہ جیتی ہوئی پارٹی کو میعاد سے پہلے اقتدار سے بے دخل کردے۔ یہ سیاست نہیں ہے بلکہ سیاست کے نام پر دادا گیری ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق، اس غلط سیاسی روایت کو پاکستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے شروع کیا۔ ان کو محمد ایوب خاں کے مقابلہ میں واضح انتخابی شکست ہوئی۔ مگر انھوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ایوب خاں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے دوبارہ نئے عنوان سے احتجاج اور ہنگامہ آرائی کی مہم شروع کردی۔ اس کے بعد پاکستان میں یہی سیاسی روایت عام طور پر چل پڑی۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے بطور واقعہ اس کو مانتے ہوئے کہا کہ اس کی جڑ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں سیاست ہی سب کچھ بن گئی ہے۔ سیاست کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے موجودہ زمانہ میں ہر جگہ اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری الہ آباد میں ۱۹۳۲ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ پھر باہر جاکر انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک جملہ میں آپ کا مشورہ کیا ہے۔ انھوں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر جواب دیا: انھیں چاہیے کہ عقل سے کام لیں۔

پاکستان کے جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے نومبر ۱۹۸۹ میں اسپین کا سفر کیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور پاکستانی مسلمان جناب سعید احمد صاحب بھی تھے۔ انھوں نے اپنا سفرنامہ ”اندلس میں چند روز“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ سفر کے آخری مرحلہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب اندلس کے ماضی وحال کے تصورات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک مرحلہ پر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا: کیا کبھی مسلمان اس خطہ کو دوبارہ ایمان سے منور کرسکیں گے۔ میں نے عرض کیا: اِس وقت تو مسلمان اپنے موجودہ خطوں کو ٹھیک سے سنبھال لیں اور

اس بات کا انتظام کرلیں تو بہت ہے کہ وہاں اندلس کی تاریخ نہ دہرائی جائے۔"

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ہندستان میں کچھ مسلم رہنما یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ یہاں اندلس کی تاریخ کو دہرانے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ مگر میں اس وقت پاکستان کے رہنما بھی یہی اندیشہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کہیں دوسرا اندلس نہ بن جائے۔ کیسا عجیب ہے یہ انجام جو سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت کی ہنگامہ خیز سیاست کے بعد برصغیر ہند کے مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مسلم اسپین کے اثرات مختلف اعتبار سے ہندستان تک بھی پہنچے تھے۔ کینن ای سیل (Canon E. Sell) نے اپنی کتاب اسلام کے مذہبی سلسلے (The Religious Orders of Islam) میں لکھا ہے کہ قلندریہ سلسلہ کے بانی بوعلی قلندر (علی ابو یوسف قلندر) اسپین سے ہندستان آئے تھے۔ وہ مسلم اسپین میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے وہ دمشق گئے۔ پھر وہ ایران پہنچے۔ آخر میں وہ ہندستان آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔ ۱۳۲۳ء میں پانی پت میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ ایک خانہ بدوش صوفی سلسلہ تھا۔ وہ کماتے نہیں تھے بلکہ لوگوں کے عطیات پر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہوتی تھی۔ اقبال نے اس شعر میں غالباً انھیں کی طرف اشارہ ہے:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

میں ۲۷ نومبر ۱۹۹۴ کو اسپین پہنچا تھا۔ ۲۸ - ۲۹ نومبر کو وہاں تین مذاہب کی انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ اس کے بعد ۳۰ نومبر کا دن خالی تھا۔ یہ دن صرف ملاقاتوں اور معلومات اور مشاہدات کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے اس موقع کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔ اس طرح جو باتیں دیکھیں یا جانیں ان کا مختصر تذکرہ اگلے صفحات میں کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۰ کے لگ بھگ زمانہ میں میں نے الطاف حسین حالی کی منظوم کتاب مسدس پڑھی تھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں حالی نے اسپین کی عظمتِ رفتہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار سادگی بیان اور تاثیر کی عجیب مثال ہیں۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کے ۵۵ سال بعد مجھے اسپین جانے کا موقع ملے گا اور وہاں میں براہِ راست طور پر قرطبہ کی سرزمین کو دیکھوں گا۔

قرطبہ (Cordoba) اسپین کا ایک قدیم شہر ہے۔ مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں اس کو فتح کیا اور ۷۵۶ء میں اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس کے بعد سے گیارھویں صدی عیسوی تک وہ مسلم اسپین کی راجدھانی بنا رہا۔ دسویں صدی میں وہ یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا اور اس کی حیثیت عالمی کلچرل سنٹر کی ہوگئی۔ ۱۲۳۶ء میں وہ مسیحی اسپین کا حصہ بن گیا۔

قرطبہ میں بہت سی مسلم یادگاریں ہیں۔ "مسجد قرطبہ" کو اس کی پُرعظمت تعمیر کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ابتداءً اس کو خلیفہ عبد الرحمٰن نے بنوایا۔ بعد کے سلاطین مزید اس کی تکمیل کرتے رہے۔ یہ مسجد بارہ ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں ہے۔ یعنی اس کی لمبائی ۷۴۰ قدم ہے اور اس کی چوڑائی ۴۴۰ قدم۔ اسس میں ۸۰۰ ستون ہیں اس کا ایک حصہ چرچ بنا دیا گیا ہے جس کو ملا کر بارہ سو ستون ہو جاتے ہیں۔ ستونوں کی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بے شمار کھجوروں کے درخت کے اوپر ایک وسیع اور منقش چھت کھڑی ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال کی زبان پر یہ شعر آ گیا تھا :

تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار　　شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

مسجد قرطبہ پر اقبال کی نظم صاحب "نقوش اقبال" کے الفاظ میں "ان کے واحد شاہکار کا حکم رکھتی ہے (۱۸۱) اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بکھرے جذبات اور حسن کی یکتائی کا معائنہ کیا۔ اس منظر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دیے جس کے نتیجہ میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم مسجد قرطبہ والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں" (۱۶۸)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کی عظیم تر نشانیاں جن کو قرآن میں "آلاء اللہ" کہا گیا ہے۔ وہ اقبال کے نازک جذبات کے تار کو چھیڑنے میں ناکام رہیں۔ البتہ مسجد قرطبہ کے در و دیوار کو دیکھنا ان کے جذبات کے تاروں کو چھیڑنے کا سبب بن گیا۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما اُمِرتُ بتشیید المساجد (مجھ کو بلند و بالا مسجدیں بنانے کا حکم نہیں دیا گیا) اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد عبد اللہ بن عباس نے کہا : لَتُزَخرِفُنَّہا کما زخرفت الیہود والنصاریٰ (تم بھی مسجدوں کو اسی طرح مزین کروگے جس طرح یہود و نصاریٰ نے مزین کیا)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ (مسجدوں کی تعمیر پر) ایک دوسرے سے فخر کریں (لا تقوم الساعۃ حتی

حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کے اندر بصیرت و معرفت موجود ہو تو زمین پر کھڑا ہوا ایک خدائی درخت اس سے زیادہ وجد کی کیفیت پیدا کر دینے والا ہے جتنا کہ کوئی انسانی عمارت۔

آبنائے جبرالٹر شرق اور غرب کا سب سے قریبی نقطۂ اتصال ہے۔ چنانچہ اسلام اولاً یہیں سے مغربی دنیا میں داخل ہوا۔ اس راستہ سے مسلمانوں کا پہلا قافلہ ۲۷ھ میں اندلس (اسپین) پہنچا۔ یہ حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس پہلے مسلم دستہ کے سربراہ عبداللہ بن نافع الفہری تھے۔

اس کے بعد دوسرا قابل ذکر مسلم دستہ ۹۱ھ میں اسپین میں داخل ہوا۔ یہ موسیٰ بن نُصیر کے ماتحت سردار طریف تھے جو پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین کے ساحل پر اترے۔ یہ کوئی فوجی مہم نہیں تھی بلکہ وہ صرف دریافت حال کے لیے اسپین کے علاقہ میں بھیجی گئی تھی۔

اس کے اگلے سال ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی مہم روانہ ہوئی۔ ابتداءً اس کے ساتھ سات ہزار آدمیوں کا لشکر تھا۔ انھوں نے اس وقت کے اسپینی حکمراں لذریق (Roderick) کی فوجوں کو ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو شکست دے کر اسپین میں پہلی مسلم سلطنت قائم کی۔ یہ اسپین کی مسلم سلطنت کا ابتدائی دور تھا جس کو عرب امراء کا عہد (۷۱۱ تا ۷۵۶ء) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد عباسیوں کی دارو گیر سے بھاگ کر ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل اسپین پہنچا۔ اس نے مقامی امراء کو شکست دے کر ۷۵۶ء میں امیر اندلس ہونے کا اعلان کیا اور اسپین (اندلس) میں باقاعدہ اموی خلافت قائم کی۔

مسلسل باہمی اختلاف اور ٹکراؤ کے باوجود اس زمانہ میں مسلمانوں نے اسپین کو بہت ترقی دی۔ یہاں تک کہ ترقیاتی قوتوں پر اختلافی قوتیں غالب آگئیں۔ ۱۰۲۳ء کے بعد وہ دور شروع ہوا جس کو ملوک الطوائف کا دور کہا جاتا ہے۔ اب ہر علاقہ کے سرداروں نے خود مختاری کا اعلان کر کے اندلس میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ یہاں تک کہ ان کی ۲۰ مختلف حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے عیسائیوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

طارق بن زیاد کے اسپین میں داخلہ کے بعد مسیحی فوج سے اس کا فیصلہ کن مقابلہ وادی لکّہ میں ہوا تھا۔ اس وقت طارق کے ساتھ (مزید کمک کو شامل کرتے ہوئے) بارہ ہزار آدمیوں کا لشکر تھا اور مسیحی

فوج کی تعداد ستر ہزار سے زیادہ تھی۔ اس موقع پر طارق نے پرجوش تقریر کی جو تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ اس کی تقریر کا ایک جملہ یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا تمہارے لیے ممکن ہے اگر تم اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دو (انّ انتهاز الفرصة فيه لممكن إن سمحتم لأنفسكم بالموت)

ایک عرب اسکالر نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں میں یہ اسپرٹ موجود نہیں، اسی لیے وہ ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آپ موت کے منہ میں کود پڑیں تو آپ غالب آجائیں گے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار مسلمان موت کے منہ میں کود ے ہیں ——— ۱۸۵۷ میں ہندستانی علما، شاملی کے میدان میں موت کے منہ میں کود پڑے۔ سید احمد شہید بریلوی کا قافلہ بالاکوٹ میں موت کے منہ میں کود پڑا۔ اسی طرح فلسطین، کشمیر، چیچنیا، بوسنیا وغیرہ میں مسلمان موت کے منہ میں کود ے ہوئے ہیں۔ مگر ان تمام اقدامات میں تباہی کے سوا کچھ اور مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ اس طرح کے مقابلوں میں کامیابی کے لیے موت کے منہ میں کودنا صرف ایک جزئی عامل ہوتا ہے نہ کہ کلی عامل۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے پورے ملک اسپین پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ مثلاً ریاض کے مجلہ الفیصل شعبان ۱۴۱۵ (جنوری ۱۹۹۵) میں شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں طارق بن زیاد المغرب کے راستہ سے اسپین میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ عربوں اور بربروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی فوج تھی۔ چار سال کی جنگی سرگرمیوں کے بعد اسلامی لشکر نے پورے اسپین پر غلبہ حاصل کر لیا (۔۔۔ الی أن سيطرت الجيوش الاسلامية على كل اسبانيا) صفحہ ۵،

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمان غالب آ گئے تھے۔ تاہم ملک کا ایک حصہ پھر بھی عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ ۹۱۰ء میں مسلمان اپنی آخری حد پر پہنچ چکے تھے۔ مگر اس وقت بھی اسپین کے مغربی حصہ میں مسیحی ریاستیں قائم تھیں۔ مسیحیوں کا زیر قبضہ علاقہ پورے ملک کے رقبہ کا تقریباً چوتھائی حصہ تھا۔ مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقہ کو اندلس کہا جاتا ہے (17/415)

اسپین (اندلس) کے مسلم عہد کی آبادی کے بارہ میں حتمی اعداد و شمار حاصل نہیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے داخلہ کے وقت اسپین کے باشندوں کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ (4,000,000) تھی۔ اس کے بعد جو عرب ہجرت کر کے وہاں گئے ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ بارسلونہ

یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر جان جینز (Juan Vernet Gines) نے لکھا ہے کہ قبضہ کی ابتدائی صدیوں میں قبول اسلام کی لہر کی وجہ سے مسلم آبادی برابر بڑھتی رہی۔ اس نے اسپین کے عیسائیوں کی تعداد میں نمایاں کمی کر دی :

The Muslim masses continued to increase during the early centuries of the occupation, because of the wave of conversions that markedly reduced the number of Christians. (17/419)

توالد وتناسل یا قبول اسلام کے ذریعہ اسپین کی آبادی میں جو اضافہ ہوا، اس کی مجموعی تعداد قطعی طور پر معلوم نہیں۔ تاہم دسویں صدی کے آخر میں مسلم اسپین کے سات بڑے شہروں (قرطبہ، طلیطلہ، المیریا، غرناطہ، سرقسطہ، بلنسیہ، مالقہ) میں آبادی کا جو اندازہ کیا گیا ہے، وہ مجموعی طور پر تین لاکھ ستاسی ہزار (387,000) ہوتا ہے۔

مسلم اسپین سیاسی اعتبار سے کسی ایک وحدت کا نام نہیں تھا۔ اس کے تین بڑے دور ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں جبرالٹر کے راستہ سے داخل ہو کر اسپین (اندلس) میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ پہلی اسپینی حکومت بغداد کی خلافت عباسی کے تحت تھی۔ اس حکومت کا پہلا امیر عبد العزیز بن موسیٰ تھا۔ اس نے اشبیلیہ کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ دوسرے امیر ایوب بن حبیب نے قرطبہ کو راجدھانی بنایا۔

اس کے بعد اموی شہزادہ عبد الرحمٰن الداخل عباسیوں کی دارو گیر سے بھاگ کر اسپین پہنچا۔ اس نے یہاں اپنی ایک فوج بنائی۔ اس نے عباسیوں کی ماتحت حکومت کو ختم کر کے باقاعدہ طور پر آزاد اموی حکومت قائم کی جس کی راجدھانی قرطبہ تھی۔ یہ حکومت ۷۵۶ء سے لے کر ۱۰۳۱ء تک باقی رہی۔

اس کے بعد تیسرا دور آیا جب کہ اندلس میں طوائف الملوکی آگئی۔ ہر علاقہ کے امیر نے مرکز سے بغاوت کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس طرح اندلس میں تقریباً بیس حکومتیں بن گئیں۔ ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو عیسائی ایک ایک کر کے ختم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں غرناطہ کی محدود حکومت اسی طرح باقی رہ گئی جس طرح انیسویں کے وسط میں دہلی میں مغل بادشاہ کی حکومت باقی رہی تھی۔ یہ آخری حکومت بھی ۱۴۹۲ء میں عیسائیوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

مسلم اسپین میں جب سیاسی انتشار کی حالت پیدا ہوئی تو اس کو وقتی طور پر افریقہ کے حکمراں

یوسف بن تاشفین نے ختم کیا تھا۔ وہ ۱۰۸۶ء میں اسپین میں داخل ہوا۔ اس نے عیسائی حکمراں الفانسو ششم (Alfanso VI) کو شکست دی۔ باغی مسلم امراء کو زیر کیا۔ اس طرح اسپین میں ایک نیا مسلم دور شروع ہوا جو ۱۲۶۹ء تک چلا۔

تاہم یہاں کے مسلمان باہمی اختلافات کے نتیجہ میں مسلسل اندرونی اور بیرونی زیادتیوں کا شکار رہے۔ آخری دور میں مسلم اسپین کی علامت سلطنت غرناطہ (۱۲۳۲ء - ۱۴۹۲) تھی۔ اس کے حکمرانوں نے وَلا غالبَ اِلاّ اللّٰہ کو اپنا شعار بنایا۔ وہ اپنی عمارتوں وغیرہ پر کثرت سے اس لفظ کو تحریر کرتے تھے۔ یہ گویا اسلامی مزاج کا ایک اظہار ہے۔ مسلمان خواہ کسی بھی حالت میں ہوں، وہ ہمیشہ خدا ہی کو اپنا بڑا بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف غیر حاکمانہ حیثیت میں بلکہ حاکمانہ حیثیت میں بھی خدا ہی کو غالب و قاہر سمجھتے ہیں۔ کبھی اور کسی حال میں یہ حقیقت ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی۔

میڈرڈ میں ایک عرب مسلمان سے اس موضوع گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگوں نے اسپین سے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کو اسپین سے اسلام کے خاتمہ کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالاں کہ بطور واقعہ یہ درست نہ تھا۔ اگر لوگ تلك الايام نداولها بين الناس کے ذہن سے سوچتے تو وہ اسپین میں سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے باوجود اسلام کے دینی وجود کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ مگر کئی صدیاں صرف فریاد و ماتم میں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ خود تاریخ کی طاقتوں نے ظاہر ہو کر اسپین میں اسلام کے احیار نو کا کام شروع کر دیا۔

نئے تقاضوں کے تحت اسپین میں مستقل طور پر ایک عمل جاری ہو گیا ہے جس کو عرب دانشور اَسبنۃ التاریخ الاسلامی فی الاندلس کہتے ہیں۔ یعنی اندلس کی اسلامی تاریخ کو اسپینی بنانا۔

اس نئے رجحان کے تحت اسپین میں بہت سے کام کیے جارہے ہیں۔ مثلاً قرطبہ میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں کئی سڑکوں پر مسلم شخصیتوں کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً شارع ابن رشد، شارع ابن الولید، شارع المنصور، شارع الزہراوی، وغیرہ۔ اسی طرح آپ قرطبہ جائیں تو وہاں کی سڑکوں کے کنارے آپ دیکھیں گے کہ عرب دور کے اہل علم کے مجسمے جگہ جگہ نصب کیے گئے ہیں۔ مثلاً ابن رشد جس کا مجسمہ ۱۹۶۷ میں لگایا گیا۔ علی بن حزم کا مجسمہ ۱۹۶۳ میں، حکیم العیون محمد بن قسوم کا مجسمہ ۱۹۶۵ میں، اور اسی طرح دوسرے بہت سے مجسمے۔ حتی کہ غرناطہ کے قریب ایک ساحلی مقام المونیکر (Almunecar) پر عبد الرحمٰن الداخل کا بہت بڑا مجسمہ لگایا گیا

ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سمندری سفر طے کرکے اموی شہزادہ عبدالرحمٰن اسپین کی سرزمین پر اترا تھا۔ یہ مجسمہ پانچ میٹر بلند ایک چوٹی کے اوپر ہے۔ وہ اپنی تلوار پر ٹیک لگائے ہوئے فاتحانہ انداز میں کھڑا ہوا ہے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات جدید اسپین میں ہو رہے ہیں جس کا ذکر اس مختصر سفرنامہ میں ممکن نہیں۔ ۱۹۸۶ میں قرطبہ میں ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی۔ اس میں اسپین کے علاوہ بیرونی ملکوں کے ۱۵۰ علماء شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع "اندلس میں اسلام" تھا۔ اس میں نہایت کھل کر اس موضوع پر تقریریں اور مباحثے ہوئے۔ عام طور پر اسپینی پریس نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایک انتہا پسند اسپینی مجلہ کامبیو نے اپنے شمارہ ۹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک رپورٹ شائع کی۔ اس کا عنوان تھا ——— اسلام ہمارے ملک میں داخل ہوتا ہے :

El Islam Nos Penetra (Cambio)

ایک عرب عالم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مسیحیوں کی دشمنی اور ظلم و زیادتی کے باوجود خدا کے فضل سے اسلام سرزمین اسپین میں بخیر و عافیت موجود ہے (رغم کل هذا الحقد الصليبي و رغم التنكيل فلا يزال الاسلام بخير في ارض الاندلس)

ایک اسپینی مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تاریخ کے بارہ میں کسی ایک کتاب کو پڑھ کر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ تاریخ بظاہر واقعات کا ریکارڈ ہے۔ مگر تقریباً تمام تاریخی کتابیں اپنے اپنے ذوق کے مطابق منتخب واقعات کا ریکارڈ کرتی ہیں۔

مثلاً اسپین کے بارہ میں مسلمانوں نے جو تاریخیں لکھی ہیں ان کا انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کی صرف اچھی باتوں کو لیا گیا ہے، اور مسیحیوں کی زیادہ تر بری باتوں کو۔ اسی طرح مسیحی حضرات نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں مسیحیوں کی اچھی باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی صرف بری باتوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین کی قدیم تاریخ کے بارہ میں مروجہ کتابوں کو پڑھ کر صحیح ذہن نہیں بنتا۔ مسلمان اور مسیحی دونوں زیادہ تر اپنے اپنے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں اس لیے قدیم اسپینی تاریخ کی صحیح تصویر نہ مسلمانوں کے ذہن میں ہے اور نہ مسیحیوں کے ذہن میں۔ اِلّا ماشاءاللہ

عرب جنرل طارق بن زیاد سات ہزار کی فوج کے ساتھ ۷۱۱ء میں اسپین میں داخل ہوا تھا۔ وہ خشکی کے راستہ سے مراکو کے ساحل پر پہنچا۔ پھر سمندری پٹی کو پار کرکے اس مقام پر اترا جس کو

جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ اس نے شاہ لذریق (شاہ اسپین) کو شکست دے کر قرطبہ اور دوسرے شہروں کو فتح کیا۔

طارق نے اپنا یہ سفر گھوڑوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کیا تھا اور اس کو اس سفر میں مہینوں لگ گئے۔ میں ۲۷ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوا اور اسی دن اسپین کی سرزمین پر پہنچ گیا۔ یہ فرق ٹکنکل ترقی کا کرشمہ ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان حیوانی حرکت کی رفتار سے سفر کرتا تھا۔ آج کا سفر اس رفتار کے ذریعہ طے ہوتا ہے جس کو مشینی حرکت (Powe.ed motion) کہا جاتا ہے۔

مشینی حرکت پہلے دخانی انجن کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پھر پٹرول سے چلنے والی کاریں بنائی گئیں۔ اب انسان ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ ہوائی جہاز بھی اچانک نہیں بن گیا۔ بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ موجودہ ترقی یافتہ صورت تک پہنچا ہے۔

اسپین میں مسلمان صرف سیاسی فاتح کی حیثیت سے نہیں آئے بلکہ وہاں وہ تعمیر نو کے نقیب بن کر داخل ہوئے۔ اسپین کے شہروں (بلنسیہ، قرطبہ، طلیطلہ، غرناطہ) میں انھوں نے بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جہاں
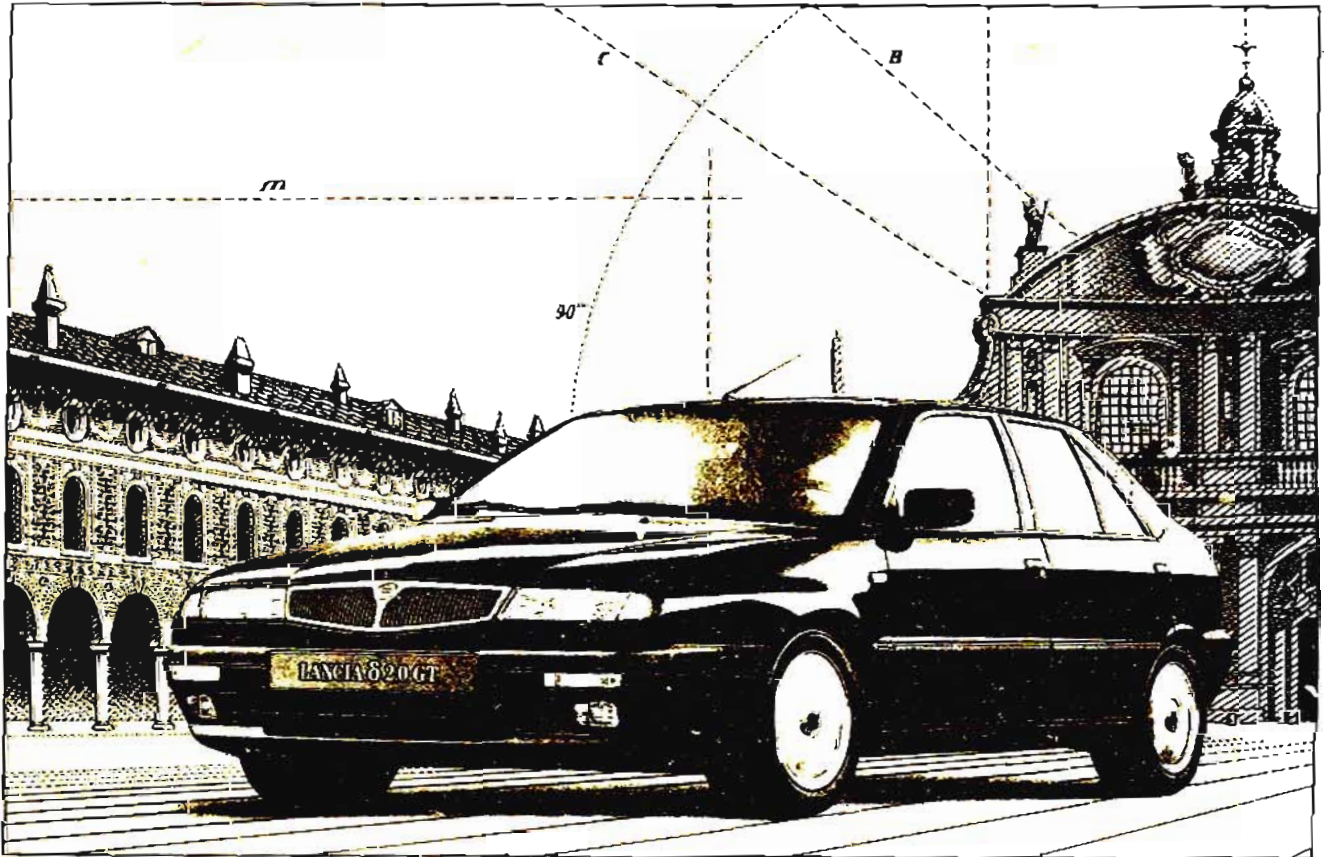
اسپین کے علاوہ دوسرے یورپی ملکوں کے طلبہ آکر علم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے اسپین کی زرخیز زمین میں ہر قسم کی زراعت اور صنعت قائم کرکے اس کو قابل استعمال بنایا۔ انھوں نے اسپین کی آبادیوں کو زیادہ بہتر شہری انتظام دیا۔

مسلمانوں نے اپنے دور حکومت (۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء) میں یہاں کی زندگی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ آج تک اس کے اثرات ختم نہ ہو سکے۔ مثلاً اسپینی اور پرتگالی زبان میں چار ہزار ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی اصل عربی ہے۔ اسپینی ڈکشنری اور پرتگالی ڈکشنری میں یہ الفاظ باقاعدہ طور پر داخل کر لیے گئے ہیں۔ یہاں کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی جدید کاروں کے پیچھے جگہ جگہ مسلم طرز تعمیر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ وغیرہ

طارق بن زیاد (فاتح اسپین) موسیٰ بن نُصیر کا ماتحت اور ان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابن کثیر نے الذھبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ طارق بن زیاد طنجہ (افریقہ) کا امیر تھا۔ وہ وہاں موسیٰ بن نُصیر کے نائب کے طور پر تھا۔ پھر جزیرۂ خضراء کے مسیحی حاکم نے اس سے اپنے دشمن کے خلاف مدد مانگی۔ اس کے بعد طارق سبتہ کے راستہ سے اندلس میں داخل ہوا۔ اس نے فرنگیوں کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھایا۔ اور اندلس میں داخل ہو کر قرطبہ کو فتح کیا اور اس کے بادشاہ کو قتل کر دیا۔ پھر اس نے موسیٰ بن نُصیر کو فتح کی خبر بھیجی:

فحسده موسى على الانفراد بهذا الفتح۔ وكتب الى الوليد يبشره بالفتح وينسبه الى نفسه۔ (البدایہ والنھایہ ۹/۸۳)	طارق بن زیاد کے تنہا فاتح بننے پر موسیٰ بن نُصیر نے اس سے حسد کیا اور خلیفہ ولید کو فتح کی خوش خبری بھیجتے ہوئے اس فتح کو اپنی طرف منسوب کیا۔

مگر اس طرح کے فیصلے تاریخ کرتی ہے نہ کہ کسی کے لکھے ہوئے یا بولے ہوئے الفاظ۔ چنانچہ موسیٰ بن نُصیر کی اس تحریر کے باوجود تاریخ میں طارق بن زیاد ہی کو فاتح اسپین لکھا گیا اور اسپین کے ساحل پر وہ جس پہاڑی کے پاس اترا تھا وہ پہاڑی اسی کی طرف منسوب ہو کر جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوئی:

Its name is derived from the Arabic jabal Tariq (Mt. Tarik), honouring Tariq ibn Ziyad, who captured the peninsula in AD 711. (8/156)

۷۱۱ء میں اسپینی پہاڑی کا نام ایک مسلمان طارق بن زیاد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کے ۱۱۴۰ سال بعد ہندستان کے پہاڑ کا نام ایورسٹ انگریز کے نام پر رکھا گیا جس کا نام سرجان ایورسٹ تھا۔ وہ انڈیا

میں تیرہ سال تک سرویر جنرل رہا۔ اسی نے پہلی بار ۱۸۵۲ میں یہ دریافت کیا کہ ایورسٹ سطح زمین پر سب سے اونچی چوٹی ہے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ دونوں واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کے مقابلہ میں آٹھویں صدی کے مسلمانوں میں کیا فرق تھا۔ پہلے زمانہ کے مسلمان اعلیٰ عزم وحوصلہ کے مالک تھے۔ اس لیے ان کا نام پہاڑوں کی چوٹیوں پر لکھا گیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں دوسری قومیں عزم وحوصلہ میں آگے بڑھ گئیں، اس لیے اب ان کا نام پہاڑوں کی چوٹیوں پر لکھا جانے لگا۔ یہ انسانی اوصاف میں فرق کا معاملہ ہے نہ کہ کسی تعصب اور سازش کا معاملہ۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ - ۴۵) تک یورپ کے چھوٹے بڑے آٹھ سامراجی ممالک دنیا پر اپنا تسلط قائم کیے ہوئے تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بھونچال نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ تھے ——— برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم، اٹلی، پرتگال اور اسپین۔

امریکہ کو دریافت کرنے والا کرسٹوفر کولمبس اٹلی میں پیدا ہوا۔ مگر اس کی وفات اسپین میں ہوئی۔ کولمبس کو اپنی سمندری مہم میں اسپین کی کوئن ازابیلا (Isabella I) سے خصوصی مدد ملی جس نے اس مہم کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ (9/907, 10/691)

واشنگٹن کی نیشنل گیلری آف آرٹ میں لکڑی کے تختہ پر پینٹنگ کے ذریعہ کولمبس کی مہم کا نقشہ آرٹسٹ کے تخیل کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کی تصویر ذیل میں درج ہے۔

امریکہ کے جنوب مشرقی علاقہ میں ایک ریاست ٹینیسی (Tennessee) ہے، وہ ۱۷۹۶ میں سولہویں

نیشنل گیلری آف آرٹ واشنگٹن میں لکڑی کے تختے پر پینٹنگ کے ذریعے کولمبس کی مہم جوئی کا اظہار

اسٹیٹ کی حیثیت سے یو ایس اے میں شامل کی گئی۔ اس ریاست کے پہاڑی علاقہ میں ایک قوم بستی ہے جس کو میلنجین (Melungeon) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ سیاہ فام ہوتے ہیں۔ ان کی موجودہ تعداد ایک ملین سے زیادہ ہے۔ ان کا بھی ایک آدمی کانفرنس میں شریک تھا۔

شکاگو میں ۲ - ۵ ستمبر ۱۹۹۴ کو چار مسلم تنظیموں کا ایک مشترک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً سولہ ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس میں ایک ڈاکٹر کینیڈی (Dr. N. Brent Kennedy) تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میں نے اپنے آبا و اجداد اور میلنجین لوگوں کے بارہ میں ریسرچ کی ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے آبا و اجداد اسپینی مسلمان (Spanish Muslims) تھے۔ جو دارو گیر (Persecution) کے زمانہ میں وہاں سے بھاگ کر امریکہ آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اپنی قوم کی اس تاریخ پر ایک فلم بنا رہا ہوں۔

اسپین میں جو مسلمان داخل ہوئے وہ محض لینے والے بن کر وہاں نہیں گئے بلکہ دینے والے بن کر گئے۔ یہ عرب اس وقت ایک تازہ دم قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے صحرائی دنیا سے نکل کر ایک سرسبز و شاداب دنیا کو دریافت کیا تھا۔ اس دریافت نے ان کے اندر نیا ولولہ پیدا کیا۔ اسپین جیسے زرخیز ملک میں ان کو ہر قسم کے مواقع ملے۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک کی امکانیات کو استعمال کر کے اس کو وقت کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ اس کی تفصیل بہت سی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ صرف ایک کتاب پڑھنا چاہیں وہ درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کریں :

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*

برٹرینڈرسل نے اپنی کتاب (*A History of Western Philosophy*) میں لکھا ہے کہ اسپین میں عرب اقتصادیات کی ایک بہترین خصوصیت ان کی زراعت تھی۔ خاص طور پر آبپاشی کا ماہرانہ استعمال جس کو انھوں نے کم پانی کے علاقہ میں رہ کر سیکھا تھا۔ آج بھی اسپینی زراعت عربوں کے آبپاشی نظام سے فائدہ اٹھا رہی ہے :

One of the best features of the Arab economy was agriculture, particularly the skilful use of irrigation, which they learnt from living where water is scarce. To this day Spanish agriculture profits by Arab irrigation works. (p. 416)

یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ ان مسلمانوں نے عرب کے ریگستانوں میں آبپاشی کا نیا نظام سیکھا تھا۔

اصل یہ ہے کہ وہ زندگی کے عزائم سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جو قوم زندگی کے عزائم سے بھری ہوئی ہو وہ اسی طرح بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی ہے۔

جے ایم رابرٹس ایک منصف مزاج مورخ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ۱۰۵۰ صفحہ کی کتاب دنیا کی تاریخ ہے:

J.M. Roberts, *The Pelican History of the World*

اس کتاب میں مصنف نے کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ عربی اسپین (Arab Spain) ہی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا سبب تھا۔ حتی کہ انڈیا، چین اور یونان کی علمی وراثت بھی اسپینی مسلمانوں ہی کے ذریعہ یورپ تک پہنچی۔ اسطرلاب ابتدائی طور پر اگرچہ ایک یونانی ایجاد تھی۔ لیکن یہ عرب ہی تھے جو اس کو مغرب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ جب چاسر (Chaucer) نے اسطرلاب کے استعمال پر اپنا رسالہ لکھا تو اس نے ایک عرب رسالہ کو بطور ماڈل اپنے سامنے رکھا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرون وسطی میں یورپ کسی بھی دوسری تہذیب کا اتنا احسان مند نہیں جتنا کہ اسلام کا:

To no other civilization did Europe owe so much in the Middle Ages as to Islam. (p. 511)

ایک صاحب کو عالمی نقشہ دکھاتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کو دیکھئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یورپ اسپین کے مقام پر آگے بڑھ کر افریقہ کی مسلم دنیا سے مل رہا ہے۔ یہ ملاقات عملاً پیش آئی۔ مگر وہ زیادہ تر سیاسی اور علمی سطح پر باقی رہی۔ دعوت کی سطح پر دونوں کے درمیان زیادہ تعلق قائم نہ ہو سکا۔

چودھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان یورپ میں ترقی کا وہ واقعہ ہوا جس کو نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ مغربی مورخین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ یونانی اور رومی تہذیب کا احیا تھا۔ جو پہلے اٹلی میں ہوا، اور پھر دوسرے یورپی ملکوں تک پہنچا۔ مگر یہاں ایک درمیانی کڑی کو حذف کر دیا گیا ہے، اور وہ اسپین ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسپین میں قدیم تہذیبی سرمایہ کو لے کر اس میں اضافے کیے۔ اس طرح اسپین میں ایک اعلیٰ تہذیب وجود میں آئی۔ پھر یہ تہذیب اٹلی میں داخل ہو کر بقیہ یورپی ملکوں تک پہنچی۔

ترقی کے اس عمل میں اسپین کی کڑی حذف ہونے کی ذمہ داری خود اسپین پر ہے۔ پندرھویں صدی میں اسپینیوں نے مسیحی چرچ کے زیرِ اثر یہ مجنونانہ کام کیا کہ علم وفن کے مسلم ماہرین کو ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ مسلمان ہی اس تہذیبی عمل کو اسپین میں جاری کیے ہوئے تھے۔ اس لیے اس جبری انخلاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کی کڑی ٹوٹ گئی، اور اٹلی ہی کی کڑی عملاً اہل یورپ کے لیے باقی رہی۔

اس مسئلہ پر ایک اسپینی اسکالر سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ واقعات کی فطری رفتار میں جب بھی تشدد کے ذریعہ تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے گی، ہمیشہ اسی قسم کا منفی نتیجہ نکلے گا۔ اس دنیا میں تدریجی تبدیلی ہی قابل عمل ہے۔ ریڈیکل تبدیلی صرف ایک لفظ ہے۔ اس کے نتیجہ میں عملاً جو چیز ظہور میں آتی ہے وہ صرف تخریب ہے نہ کہ تبدیلی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی اور نویں صدی عیسوی کے درمیان یورپ میں بت اور مذہبی تصویروں کے خلاف جو مہم اٹھی اس کو بھی مسلم اسپین ہی سے تحریک ملی تھی (ان الدعوۃ الی نبذ الصور والتماثیل کانت متأثرۃ بالاسلام)

کلودیس (Claudius) کو ۸۲۸ء میں تورین کا اسقف مقرر کیا گیا۔ وہ مذہبی تصویروں کو غیر مقدس قرار دینے میں اتنا شدید تھا کہ وہ اس قسم کی تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا اور اپنے چرچ میں اس کی عبادت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ کلودیس اندلس میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی پرورش ہوئی (ولد وربّی فی الاندلس الاسلامیۃ) ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ۱۳۹-۱۳۸

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی مسلم سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائی حکمرانوں نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو مارنا اور بھگانا شروع کر دیا۔ مگر بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان اسپینیوں کے لیے بہترین مزدور اور بہترین کاریگر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کے صنعت و حرفت اور زراعت و باغبانی کے نظام کو ترقی دی تھی اور اس کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس لیے اسپینیوں کو عام مسلمانوں سے وہ نفرت نہیں ہو سکتی تھی جو ان کو سیاسی حکمرانوں سے تھی۔

مگر مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد ان مسلمانوں نے عیسائی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ بار بار ان کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ اگرچہ ناکافی تیاری کی بنا پر وہ ہر بار کچلے جاتے تھے۔ مزید یہ کہ اسپین کی مذہبی مخالفت کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں تھا بلکہ وہ تمام غیر عیسائی مذاہب سے تھا۔

چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ اسپینی یہودی بھی یکساں عتاب کا نشانہ بنے۔

غرناطہ کی موجودہ آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً ایک ہزار اسپینی مسلمان ہیں۔ ان مسلمانوں کو حکومت وقت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو چھپائے بغیر آزادی کے ساتھ شہر میں رہتے ہیں۔ ۱۹۹۳ میں غرناطہ کے مسلمانوں نے عید الفطر کی نماز الحمراء میں ادا کی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اسپین کے ٹی وی سسٹم نے اس نماز کی مکمل فلم بندی کی تھی۔ اس کو ٹی وی کے نیشنل پروگرام کے تحت براڈ کاسٹ کیا گیا جس کو پورے ملک میں نہایت شوق کے ساتھ دیکھا گیا۔

کچھ لوگ اسپین کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے کہ سارا اسپین مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا۔ مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے اور فطرت کے خلاف بھی۔ اصل یہ ہے کہ وہاں تین طبقے تھے۔ ایک، مذہبی طبقہ، دوسرے، حکمراں طبقہ، تیسرے، عوام۔

یہ صحیح ہے کہ مذہبی طبقہ (مسیحی چرچ) مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کا دشمن بن گیا تھا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں وہاں مذہبی طبقہ کا بہت اثر تھا اس لیے انھوں نے دونوں فرقوں پر کافی ظلم بھی کیا۔ مگر حکمراں طبقہ کے دل میں مسلمانوں کے لیے وہ نفرت نہ تھی۔ کیوں کہ مسلمان ان کے ملک کی ترقی کا سبب بنے ہوئے تھے۔

مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ چرچ کے لوگوں نے جامع قرطبہ کے کچھ ستونوں کو گرایا اور اس کے ایک حصہ میں چرچ بنا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے چارلس پنجم (۱۵۰۰ — ۱۵۵۸ء) کو اس چرچ کے افتتاح کے لیے بلایا۔ مگر شاہ اسپین جب وہاں آیا اور مسجد کے بقیہ حصہ کو دیکھا تو وہ بہت غضب ناک ہوا۔ اس نے کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ مسجد اتنی خوب صورت اور اتنی عالی شان ہے۔ اگر میں جانتا تو تم کو ہرگز اسے توڑنے کی اجازت نہ دیتا۔ کیوں کہ اس کے ایک حصہ کو توڑ کر تم نے جو چرچ بنایا ہے وہ تم دوسری جگہ بھی بنا سکتے تھے۔ مگر یہ مسجد تو ایک ایسی نادر عمارت ہے جس کی دوسری مثال سارے عالم میں موجود نہیں۔

چارلس پنجم نے اہل کلیسا کے زیر اثر ۱۵۲۵ء میں بلنسیہ اور اراغون کے مسلمانوں کے نام یہ حکم جاری کیا کہ وہ اپنی زبان، مذہب، لباس، عادات کو ترک کر کے مکمل طور پر عیسائی ہو جائیں، ورنہ ان کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس کے بعد ۱۵۲۸ میں بلنسیہ کے بارہ افراد کا ایک وفد بادشاہ سے ملا اور اس سے درخواست کی کہ اس حکم کو واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس حکم کا نفاذ روک دیا۔ اس

کی وجہ یہ تھی کہ یہ مسلمان اپنی محنت اور اپنی مہارت کی بنا پر وہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں کے لیے قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو نکال دیا گیا تو ان کے کھیت اور باغ ویران ہو جائیں گے اور ان کی اقتصادیات پر اس کا نہایت مضر اثر پڑے گا۔

مسلم اقتدار کے خاتمہ کے بعد مسجد قرطبہ کے ایک حصہ کو عیسائیوں نے چرچ میں تبدیل کر دیا۔ مگر اس کا سبب عیسائیوں کے ظلم کے ساتھ خود مسلمانوں کی نادانی بھی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں ایک مسیحی پیشوا سینٹ ونسنٹ (Saint Vincent Ferrer) گزرا ہے۔ مسیحیوں نے اس کے نام پر قرطبہ میں دریا کے کنارے ایک چرچ تعمیر کیا تھا۔ اس علاقہ پر سیاسی قبضہ کے بعد مسلمانوں نے عین اسی چرچ کی جگہ اپنی مسجد بنا دی۔ اس طرح اس مسجد کے ساتھ غیر ضروری طور پر نزاع کی حالت قائم ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کو ۷۸۶ء میں سلطان عبد الرحمٰن الداخل نے عیسائیوں کو راضی کر کے اس جگہ کو خرید لیا اور وہاں مزید توسیع کے ساتھ عظیم مسجد قرطبہ کی تعمیر کی۔ اس تعمیر پر دو سال میں ۸۰ ہزار دینار خرچ ہوئے۔ عیسائیوں کو جب دوبارہ سیاسی غلبہ ملا تو انھوں نے مسجد کے توسیعی حصہ کو تو چھوڑ دیا۔ مگر سینٹ ونسنٹ چرچ کی ابتدائی جگہ کو دوبارہ انھوں نے گرجا میں تبدیل کر دیا۔

اسپین میں مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسیحیوں نے بہت سی مسجدوں کو چرچ بنا دیا تھا۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے بعض مغربی مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ مسیحیوں کی طرف سے جوابی کارروائی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کثیر تعداد میں چرچ کو مسجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ مسیحیوں کو جب غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی جگہ پر اپنے چرچ بنا دیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں :

"اسلام میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کوئی علاقہ مسلمانوں نے صلح سے نہیں بلکہ بزور شمشیر جنگ کے ذریعہ فتح کیا ہو تو وہاں کی زمینوں اور عمارتوں پر انھیں شرعاً مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس اختیار میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو ضرورۃً ختم کر دیں، یا مسجد میں تبدیل کر لیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے اس شرعی اختیار کو بہت کم استعمال کیا۔ بعض مقامات پر کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت کلیسا کو مسجد بنایا گیا" اندلس میں چند روز، صفحہ ۲۱

یہ بات صحیح نہیں۔ "بزور شمشیر فتح" کا مذکورہ حکم صرف اس وقت ہے جب کہ فریق ثانی خود جارحیت

کرے اور اس کے نتیجہ میں جنگ پیش آئے۔ جب کہ معلوم ہے کہ اسپین نے اس قسم کا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جارحیت کی صورت میں بھی مذکورہ شرعی مسئلہ کا تعلق صرف زمینوں اور عمارتوں سے ہے۔ اس میں عبادت خانہ شامل نہیں ہے۔ کسی قوم کے عبادت خانہ کو توڑنا صرف اس وقت جائز ہے جب کہ اس کو بنانے والے سب کے سب اسلام قبول کر کے نمازی بن گئے ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کو ناحق مارنا گویا تمام انسانوں کو مارنا ہے۔ اسی طرح کسی ایک عبادت گاہ کو ڈھانا گویا تمام عبادت گاہوں کو ڈھانا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کمیت قابل لحاظ نہیں ہوتی۔

اسپین سے مسلمانوں کا کلی انخلاء نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے زیر قبضہ اسپین میں غیر مسلموں سے انتہائی رواداری اور انصاف کا معاملہ کیا تھا۔ مسلمانوں کی علمی ترقیوں سے مقامی آبادی اتنا زیادہ متاثر تھی کہ لوگ اسی طرح عربی لکھنے اور بولنے کو فخر سمجھتے تھے جس طرح برٹش حکومت کے دور میں ہندستان کے لوگ انگریزی لکھنے اور بولنے کو فخر سمجھنے لگے تھے۔ اسپینیوں کی ایک بڑی تعداد مستعرب (Mozarab) بن گئی تھی۔ یہ تقریباً اسی قسم کے لوگ تھے جیسے مغل دور میں ہندستان کے کائستھ۔ مسلمان اسپین کی زراعت اور صناعت کے لیے بہترین کاریگر اور ماہرین فراہم کر رہے تھے۔ اسپینیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حتی کہ خود اسپین کے مسیحی حکمرانوں میں کئی حکمراں ایسے تھے جو مسلمانوں کے حق میں اپنے دل کے اندر نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس طرح کے مختلف طاقت ور اسباب اس میں مانع تھے کہ مسلمانوں کو مکمل طور پر اسپین سے باہر نکال دیا جائے۔

تقریباً تین لاکھ (300,000) مورسکو (Moriscos) جو اسپین سے نکالے گئے وہ بھی قانون فطرت کے مطابق، عسر میں یسر کی مثال بن گئے۔ یہ لوگ اسپین سے نکل کر زیادہ تر الجیریا، تیونس اور مراکو میں بس گئے تھے۔ ان کا یہ آنا ان ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ ان افریقی ملکوں میں تبلیغ اسلام کے لیے یہاں قادریہ سلسلۂ تصوف کی ایک خانقاہ ساقیۃ الحمراء کے نام سے قائم تھی۔ مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ مسلم مذہب کو ان افریقیوں کے اندر داخل کرنے کا کارنامہ ان اسپینی مسلمانوں نے انجام دیا جو ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اسپین سے نکال دیے گئے تھے:

But the honour of winning an entrance among them for the Muslim faith was reserved for a number of Andalusian Moors who were driven out of Spain after the taking of Granada in 1492. (p. 129)

اقبال کو دو بار اسپین کے علاقہ میں جانے کا موقع ملا۔ پہلی بار ۱۹۰۸ میں جب یورپ کے ایک سفر کے دوران وہ اسپین کے ساحل (سسلی) سے گزرے۔ اس پر انھوں نے ایک تاثراتی نظم بھی لکھی تھی جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔

اسپین کے لیے اقبال کا دوسرا سفر جنوری ۱۹۳۳ میں ہوا۔ اس وقت تیسری گول کانفرنس لندن میں ہوئی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے جو لوگ ہندستان سے گئے ان میں سے ایک اقبال بھی تھے۔ کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ پیرس ہوتے ہوئے غالباً ۵ جنوری کو اسپین میں داخل ہوئے اور اپنے تین ہفتہ کے قیام میں میڈرڈ اور غرناطہ اور قرطبہ کو دیکھا۔

اقبال کو اسپین کے علاوہ دوسرے کئی ملکوں کے سفر کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں:
بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے (بال جبریل)۔ مگر صرف کسی ملک کا سفر کرنا یا اس کو دیکھنا اس ملک کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایک سفر میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ انجینیر تھے اور یورپ کی ایک شپنگ کمپنی میں ۲۰ سال سے ملازم تھے۔ انھوں نے دنیا کے اکثر ملکوں کا سفر کیا تھا۔ مگر جب میں نے گفتگو کی تو اندازہ ہوا کہ عالمی زندگی کے کسی بھی پہلو پر وہ کوئی گہری واقفیت نہیں رکھتے۔

اصل یہ ہے کہ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، آدمی کو پیشگی طور پر ایک تیار ذہن (Prepared mind) ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ کسی چیز کو حقیقی طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ تاریخ اور دوسرے علوم کے گہرے مطالعہ سے آدمی ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو چکا ہو۔ اس کے بعد ہی وہ کسی ملک کو گہرائی کے ساتھ جان سکتا ہے یا وہاں کے سفر سے کوئی حقیقی بات دریافت کر سکتا ہے۔

۱۹۰۸ میں اقبال نے اسپین کے ساحل کو دیکھ کر کہا تھا:

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار　　وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

یہ محض ایک شاعرانہ تخیل ہے نہ کہ واقعی معنوں میں کوئی تاریخی واقعہ۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کبھی بھی "تہذیب حجازی" کا مزار نہیں بنا۔ وہاں سے بعض مسلم خاندانوں کا سیاسی اقتدار ضرور ختم ہوا۔ مگر جہاں

تک حجازی تہذیب یا اسلام کا معاملہ ہے اس کا وجود خاندانی اقتدار کے خاتمہ کے بعد بھی اسپین میں باقی تھا اور آج بھی وہ وہاں موجود ہے۔

اقبال نے فاتح اسپین طارق بن زیاد کے بارہ میں لکھا ہے کہ طارق نے جب اندلس کے ساحل پر اپنی کشتی کو جلا دیا تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر میں یہ تم نے غلط کام کیا :

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت　　گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطاست

حالانکہ کشتیوں کو جلانے کا یہ افسانہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اور وہ کسی بھی قابل اعتماد تاریخی کتاب میں موجود نہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : الرسالہ مئی ۱۹۸۹)

اسی طرح اقبال اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں :

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی　　ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

یہ بھی اقبال کی ایک تاریخی بھول ہے۔ کسی ابن بدرون نے کبھی غرناطہ کا مرثیہ نہیں لکھا۔ اصل یہ ہے کہ ابن عبدون الفہری (م ۵۲۹ ھ) ایک اسپینی شاعر تھا۔ اس کا تعلق بطلیوس (Badajoz) کے مسلم حکمراں متوکل بن المظفر سے تھا جو ملوک الطوائف میں سے ایک تھا۔ ابن عبدون اسی متوکل کا وزیر تھا اور شاعر بھی تھا۔ متوکل بن المظفر کو یوسف بن تاشفین نے اس کے دو بیٹوں سمیت مروا دیا تھا۔ اس المیہ پر ابن عبدون نے عربی میں ایک مرثیہ لکھا۔ اس مرثیہ کا تعلق سقوط بطلیوس سے تھا نہ کہ سقوط غرناطہ سے۔

ابن عبدون کے اس مرثیہ کی شرح ایک صاحب نے کی جو شاعر نہیں تھے بلکہ صرف عالم تھے۔ ان کا نام ابن بدرون (عبدالملک بن عبداللہ بن بدرون) تھا۔ انھوں نے ۶۰۸ ھ میں وفات پائی۔

مسجد قرطبہ پر اقبال کی طویل نظم کا ایک مصرعہ یہ ہے : کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق۔ اس طرح کے بہت سے اشعار اقبال کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے بارہ میں کہا :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اسی طرح وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ حتی کہ ان کی ایک تعریفی نظم رام کے بارہ میں بھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز　　اہلِ وطن سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اقبال کے اس قسم کے اشعار کو اُس زمانہ میں برا نہیں مانا گیا۔ لیکن اس طرح کی بات اگر آج کوئی لکھے

تو خود اقبال کے پرستار یہ کہیں گے کہ دیکھو اس شخص کو، یہ ہندو کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا تشخص مٹانا چاہتا ہے۔

عبد المجید بن عبد اللہ بن عبدون الفہری (م ۵۲۹ھ) اندلس کے ایک ممتاز عالم اور ادیب ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ابو مروان عبد الملک ایک وزیر تھے۔ ان کے لڑکے ابو بکر ایک کاتب سے "کتاب الاغانی" کی کتابت کروا رہے تھے۔ درمیان میں ایک روز انھیں کتابت شدہ حصہ کو اصل نسخہ سے ملا کر اس کی تصحیح کرنا تھا۔ اس وقت کتابت کا اصل نسخہ موجود نہ تھا۔ انھوں نے کسی آدمی کو اصل نسخہ لانے کے لیے باہر بھیجا تھا۔

اس درمیان میں ایک بوڑھا آدمی وہاں آگیا جو بظاہر غیر اہم تھا۔ بات چیت کے دوران اس کو معلوم ہوا کہ ابو بکر کے ہاتھ میں کتاب الاغانی ہے اور وہ مقابلہ کر کے اس کی تصحیح کرنے کے لیے اصل نسخہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ میں بولتا ہوں، تم اپنی کتاب کھول کر ملالو۔ ابو بکر نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کتاب ہے۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ کتاب تو نہیں ہے، البتہ یہ کتاب مجھ کو یاد ہے۔ اس کے بعد بوڑھے آدمی نے اپنے حافظہ سے کتاب پڑھنا شروع کیا اور ابو بکر اپنے کتابت شدہ نسخہ کو کھول کر اس سے ملانے لگے۔ ابو بکر کو سخت حیرت ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ ایک لفظ کے فرق کے بغیر بوڑھا آدمی کتاب کو دہراتے چلا جا رہا ہے۔

ابو بکر حیرانی کے عالم میں گھر کے اندر گئے اور اپنے باپ کو پورا قصہ سنایا۔ ان کے باپ ابو مروان عبد الملک ننگے پاؤں بھاگ کر باہر آئے۔ انھوں نے اس بوڑھے آدمی کو گلے سے لگایا۔ ان کی ضیافت کی اور پھر اعزاز کے ساتھ سواری دے کر انھیں رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد بیٹے نے پوچھا کہ یہ بوڑھا آدمی کون تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ تمہارا برا ہو، یہ اندلس کے ادیب اور علم ادب میں اس کے سردار ابن عبدون ہیں (ویحك هذا اديب الاندلس وسيدها فی علم الادب، هذا ابومحمد عبد المجيد بن عبدون) الاعلام ۴/ ۱۴۹

اسپین کے مسلم عہد میں جو بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک ابن حزم ہیں۔ وہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا زمانہ ۳۸۴ھ اور ۴۵۶ھ کے درمیان ہے۔ یہ زمانہ مسلم اسپین کا انتہائی اختلاف کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے اندلس میں مالکی فقہاء کا غلبہ تھا جو قیاس سے کام لینے میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔

ابن حزم نے سمجھا کہ فقہ میں قیاس کو داخل کرنا بس یہی اختلاف اور بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ چنانچہ وہ قیاس کے منکر ہوگئے اور صرف ظاہر پر زور دینا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کا نام ہے : ابطال القیاس والرأی والاستحسان والتعلیل۔

ابن حزم نے لکھا کہ إن اللہ تعالیٰ یقول : وما اختلفتم فیہ من شیئ فحکمہ الی اللہ۔ ولم یقل سبحانہ وتعالیٰ فحکمہ الی الرائ والقیاس (الاحکام فی اصول الاحکام ۷/۵۳)

اس ظاہری مسلک کی بنا پر ابن حزم بہت زیادہ نزاعی شخصیت بن گئے۔ وہ کئی بار قید کیے گئے۔ ان کی تکفیر وتضلیل کی گئی۔ ان کی کتابیں جلادی گئیں۔ حتیٰ کہ ان کی لکھی چار سو کتابوں میں سے اب بمشکل چالیس کتابیں دنیا میں باقی ہیں۔

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ابن حزم کا کیس دراصل انتہاپسندی کا کیس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانہ کے فقہاء کثرت سے قیاس کا غلط استعمال (سوء استخدام) کر رہے تھے۔ لیکن اگر تمام فقہی کتابیں جلادی جائیں اور صرف قرآن وحدیث دنیا میں رہ جائے تب بھی غلط استعمال کی برائی باقی رہے گی۔ کیونکہ غلط استعمال کا سبب متن میں نہیں ہوتا بلکہ آدمی کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔

8

میں نے مزید کہا کہ فقہاء اسلام نے چار چیزوں کو مصادر شریعت قرار دیا ہے —— قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کے الفاظ کی اتباع کی جائے تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مصادر شریعت تین ہیں : قرآن، سنت اور اجتہاد۔ اجتہاد سے مراد آزادانہ رائے نہیں ہے، بلکہ وہ رائے ہے جو قرآن وسنت کی بنیاد پر مخلصانہ طور پر قائم کی گئی ہو۔ اجتہاد کے مختلف درجے ہیں۔ انھیں درجات کا نام قیاس اور اجماع ہے۔

قاضی مُنذِر بن سعید قرطبہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۳۶۶ ھ میں قُرطبہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ علم اور زہد دونوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ کے اندلس میں وہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ اور آخر تک اس عہدہ پر قائم رہے۔

ابن الاثیر نے اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں ۳۶۶ ھ کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ سلطان عبدالرحمٰن الناصر نے جب الزہراء کا محل تعمیر کر لیا تو ایک دن وہ اپنے سونے کے تخت پر

بیٹھا۔ دربار میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ سلطان نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم نے سنا ہے کہ کبھی کسی نے ایسا عالی شان محل بنایا ہو۔ حاضرین نے کہا کہ ہم نے نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا (لم نرَ ولم نسمع بمثلہ) لوگوں نے خوب تعریف کی مگر قاضی منذر سر جھکائے بیٹھے رہے۔

آخر میں سلطان نے قاضی منذر سے بولنے کے لیے کہا۔ قاضی منذر رو پڑے اور ان کے آنسو ان کی داڑھی تک آ گئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم، میرا یہ گمان نہیں تھا کہ شیطان تمہارے اوپر اتنا زیادہ قابو پا جائے گا کہ وہ تم کو کافروں کے درجہ تک پہنچا دے۔ سلطان نے کہا کہ دیکھئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیسے آپ مجھے کافروں کے درجہ تک پہنچا رہے ہیں۔ اس کے بعد قاضی منذر نے قرآن سے سورہ الزخرف کی آیات ۳۳ - ۳۵ پڑھیں۔ ان آیتوں کو سن کر سلطان عبد الرحمٰن سخت غمگین ہوا اور رونے لگا۔ اس نے کہا کہ اللہ آپ کو بہتر جزا عطا فرمائے۔ اور مسلمانوں میں آپ جیسے بہت لوگ پیدا کرے۔

اسی طرح ایک بار اندلس میں قحط پڑا۔ سلطان عبد الرحمٰن نے ایک آدمی کو قاضی منذر کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ قاضی صاحب بارش کے لیے دعا کریں۔ قاضی منذر نے قاصد سے پوچھا کہ سلطان خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا کہ میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ انھوں نے شاہی لباس اتار کر معمولی کپڑے پہن لیے تھے اور زمین پر سر رکھ کر یہ کہہ رہے تھے کہ خدایا، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، کیا تو میری وجہ سے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

قاضی منذر نے شاہی قاصد سے کہا کہ تم بارش لے کر جاؤ۔ کیوں کہ جب زمین کا بادشاہ عاجزی اختیار کرتا ہے تو آسمان کا بادشاہ رحم فرماتا ہے۔ اس کے بعد قاضی منذر باہر نکلے اور استسقاء کی نماز پڑھی۔ پھر منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ لوگ تقریر سن کر رونے لگے۔ جب وہ گھر لوٹے تو بارش شروع ہو چکی تھی (المجلد الثامن، صفحہ ۷۵ - ۷۶)

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ بعد کے دور میں علماء کے درمیان یہ غلط روایت چل پڑی کہ لوگوں نے حکومت میں عہدہ لینے کو کمتر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا۔ یہ عالم کے مفاخر میں شمار ہونے لگا کہ اس کو حکومت نے عہدہ کی پیش کش کی اور اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ حالاں کہ یہ پیغمبرانہ سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مشرک بادشاہ کے یہاں عہدہ قبول کیا۔

میں نے کہا کہ یہ روش اسلامی مزاج کے مطابق نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما، صالحین اور حکمرانوں کے بیچ میں دوری قائم ہوگئی۔ اس دوری کے نتیجہ میں بہت سے اعلیٰ مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔ اسلام کی بعد کی تاریخ کا یہ ایک افسوس ناک باب ہے کہ رجاء بن حیوہ اور قاضی ابو یوسف اور قاضی منذر اور شیخ احمد سرہندی جیسی مثالیں اس میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

اسپین کے مسلم عہد میں جو بڑے بڑے دماغ اٹھے ان میں سے ایک ممتاز نام ابن الطفیل کا ہے۔ وہ ۱۱۰۰ء میں اندلس میں وادی آش (Guadix) میں پیدا ہوا۔ ۱۱۸۵ء میں مراکش میں اس کی وفات ہوئی۔ الموحدین کا سلطان، ابو یوسف المنصور اس کے جنازہ میں شریک ہوا۔ ابن الطفیل ایک فلسفی اور طبیب تھا۔ اس کی تعلیم غرناطہ میں ہوئی۔ وہ ایک اوریجنل فکر رکھنے والا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے حالات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے فرانسیسی مصنف لیون غوتیہ (Leon Gauthier) کی کتاب بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

اس کی ایک نسبتاً مختصر کتاب حیّ بن یقظان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب ہے زندہ ابن بیدار (The living one, son of the vigilant) یہ ایک فلسفیانہ کہانی ہے۔ ایک انسان بچپن سے لے کر بڑی عمر تک خالص فطرت کے ماحول میں رہتا ہے۔ اس کا کسی انسان سے سابقہ پیش نہیں آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت اور کائنات کے بےآمیز مطالعہ کے ذریعہ خدا کو پالیتا ہے۔ ابن طفیل اس دل چسپ کہانی کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خدا ایک حقیقت ہے اور عین عقل انسانی کا تقاضا ہے۔

حیّ بن یقظان ہی کے نمونہ پر بعد کو رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) لکھی گئی۔ ابن طفیل کی اس کتاب کا ترجمہ تقریباً ستر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ڈچ زبان میں اس کا ترجمہ ۱۶۷۲ء میں ہوا۔ روسی زبان میں ۱۹۲۰ میں، اسپینی زبان میں ۱۹۳۴ میں۔ اس عربی کتاب کا پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۶۷۱ء میں ہوا۔ یہ ترجمہ ایڈورڈ پوکوک (Edward Pococke) نے کیا تھا۔

مسلم اسپین میں ادب و شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ کثیر تعداد میں شعرا پیدا ہوئے۔ خود اسپین کا پہلا اموی حکمراں عبد الرحمن الداخل بھی شاعر تھا۔ خلیفہ عبد الرحمن الناصر (الثالث) کے دربار کا ایک شاعر اس کے دور کی تعریف میں کہتا ہے کہ اللہ نے اسلام کا راستہ واضح کر دیا۔ اور لوگ دین میں جوق در جوق داخل ہو گئے :

قَـد اَوضَحَ اللّٰهُ للاسلام مِنـهاجا وَالناسُ قد دخلوا فی الـدین افـواجا

دوسرا شاعر مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد کہتا ہے کہ کیا یہ شہر دینِ اسلام کا محفوظ قلعہ نہ تھا۔ مگر خدا نے اس کو ذلیل کر دیا :

الم تلك معقلا للـدین صعبـا فـذ لّلَهُ کما شاء القـدیر

ایک اور شاعر کے مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے کہ ہر چیز جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں نقص کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی آدمی کو خوش گوار زندگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے :

لکل شیئٍ اذا مـا تـمّ نقصـانُ فـلا یغُرّ بطیبِ العیش انسانُ

یہ تین اشعار نہ صرف اسپین کے مسلم دور کی تصویریں ہیں۔ بلکہ اس میں پوری دنیا میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اندلس میں دوسری ترقیوں کے ساتھ فن موسیقی اور آلات موسیقی کی بھی کافی ترقی ہوئی۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے عبد العزیز بن عبد الجلیل کی کتاب الموسیقا الاندلسیۃ المغربیۃ دیکھی۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ میں کویت سے چھپی ہے۔ وہ ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاہم اس موضوع سے ناآشنا ہونے کی بنا پر وہ میری سمجھ میں زیادہ نہ آسکی۔

اسپین کی مسلم سلطنت کے زوال کے بعد جب ان حکمرانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں کھنڈر یا غیر آباد ہو چکی تھیں۔ ان کے محلوں اور باغوں میں انسانوں کے بجائے جانور رہنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں ۴۳۵ھ میں ابو الحزم بن محمد بن جہور کا گزر مدینۃ الزہراء سے ہوا۔ اس نے جب شاہی دور کی ان برباد عمارتوں کو دیکھا تو اس پر ایک عجیب حیرت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے تاثر کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے :

قلتُ یوماً لـدارِ قومٍ تفـانوا این سُـکّانُكِ العـزاز علینـا

فاجابت هنـا اقامـوا قلیـلا ثـم سـاروا ولستُ اعلم اینـا

یعنی وہ قوم جو فنا ہو گئی، میں نے ایک دن اس کے مسکن سے پوچھا۔ تمہارے وہ مکین کہاں گئے جو ہم کو بہت عزیز تھے۔ اس نے جواب دیا کہ تھوڑے دن وہ یہاں ٹھہرے تھے۔ پھر وہ چلے گئے اور مجھ کو نہیں معلوم کہ وہ کدھر گئے (نفح الطیب)

یہ صرف مدینۃ الزہراء کے مکینوں کی کہانی نہیں، یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اس

دنیا میں جو بھی آتا ہے، تھوڑی مدت کے بعد وہ اس طرح یہاں سے چلا جاتا ہے کہ اس کے چھوڑے ہوئے کھنڈروں کے سوا کوئی اور نشان اس کا یہاں باقی نہیں رہتا۔

اسپینی زبان میں ابھی تک ایک مثل ہے جس کا ترجمہ عربی میں ایک شخص نے اس طرح کیا: کل مَن احبّہ اللّٰہ رَزقہ منزلاً فی اشبیلیہ (جس آدمی سے خدا محبت کرتا ہے، اس کو اشبیلیہ میں ایک مکان دے دیتا ہے)

یہ مثل اس وقت بنی جب اشبیلیہ (اور دوسرے اندلسی شہروں میں) مسلم تمدن کا غلبہ تھا۔ اس وقت یہ شہر عمدہ مکانات، سڑکیں، باغات اور صاف ستھری زندگی کے لیے ایک عالمی نمونہ بنے ہوئے تھے۔

المعتمد بن عباد اسی اشبیلیہ کا حکمراں تھا۔ یہاں ابھی تک ایک قدیم عمارت الکازار کے نام سے ہے۔ جو القصر کی اسپینی صورت ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے فخر کے ساتھ اس واقعہ کو دہرایا کہ ملوک الطوائف کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور المعتمد بن عباد نے افریقہ کے حکمراں یوسف بن تاشفین کو مدد کے لیے بلایا۔ اس وقت ایک مسلمان نے اس کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ جب یوسف بن تاشفین یہاں اپنی فوجوں کو لے کر آئے گا تو وہ تم کو بے دخل کر کے خود تمہاری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ المعتمد نے جواب دیا: رعی الجمال ولا رعی الخنازیر۔ یعنی اگر میں ایک عرب بادشاہ کا قیدی بن کر اس کا اونٹ چراؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں ایک فرنگی بادشاہ کا قیدی بن کر اس کی خنزیروں کو چراؤں۔

ایک صاحب نے فخر کے ساتھ اس قول کو دہرایا۔ میں نے کہا کہ انسانوں کو "اونٹ" اور "خنزیر" میں بانٹنا یہ خالص قومی مزاج ہے۔ مومن کا مزاج داعیانہ مزاج ہوتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اللہ کے بندوں کے روپ میں دیکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی غیر داعیانہ مزاج اندلسی مسلمانوں کی تباہی کا سبب بنا۔ عیسائیوں کو "خنزیر" سمجھنے کے بجائے اگر وہ ان کو "مدعو" سمجھتے تو شاید اسپین کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ایک عرب سیاح نے اپنے اسپینی سفر کے تاثرات بتاتے ہوئے کہا کہ جب میں نے قرطبہ کی تاریخی یادگاریں دیکھیں جو ابھی تک اپنی عظمت کی داستان سنا رہی ہیں تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت حالت یہ تھی کہ سیاحوں کے قافلے میرے پاس سے گزر رہے تھے اور وہ میری حالت کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ ایک عربی ہے جو اپنے اسلاف کی عظمت پر رو رہا ہے

(تمرُّ بی قوافل السیّاح فیعرفون انی عربی ابکی مجد اجدادی)

میں نے کہا کہ اس قسم کی عمارتوں کو دیکھ کر مجھے بھی رونا آتا ہے۔ مگر میرا رونا اسلاف کی عظمت کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر ہوتا ہے کہ انسان کتنا زیادہ نادان ہے کہ ایسی چیزوں کے اوپر اپنی عظمت کا محل کھڑا کرتا ہے جو آخر کار کھنڈر ہو جانے والی ہیں۔

غرناطہ کے قصر الحمراء میں ایک جگہ ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس میں بڑی عبرت ہے۔ اس دیواری کتبہ میں اسپینی زبان میں لکھا ہوا ہے کہ میکسیکو کا ایک سیاح آر ی ایکاسا الحمرا کو دیکھنے کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ جب وہ دونوں محو حیرت ہو کر اس تاریخی محل کو دیکھ رہے تھے تو عین اسی وقت ایک سائل وہاں آگیا جو کہ اندھا تھا۔ سیاح نے سائل کو دیکھ کر اپنی بیوی سے کہا : اے خاتون، اس کو زیادہ صدقہ دے دو کیوں کہ کسی آدمی کی اس سے بڑی کوئی بدبختی نہیں ہو سکتی کہ وہ غرناطہ کے قصر کے سامنے کھڑا ہو مگر وہ اس کو دیکھنے کے لیے اندھا ہو۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس سے بھی زیادہ بدقسمت وہ آنکھوں والا انسان ہے جو فطرت کی حسین تر دنیا کے سامنے ہو مگر وہ اس میں خدا کا جلوہ دیکھنے سے محروم رہے۔

قصر الحمراء کے ایک کمرہ کے سامنے ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں واشنگٹن اروِنگ نے قیام کیا تھا۔

اروِنگ (Washington Irving) ایک امریکی ادیب تھا۔ ایک امریکی ادارہ نے ۱۸۲۶ء میں اس کو اسپین بھیجا۔ یہاں آکر جب اس نے غرناطہ کو دیکھا تو اس کی خوب صورتی پر وہ اتنا گرویدہ ہوا کہ وہ یہیں مقیم ہو گیا اور غرناطہ اور الحمراء کے بارہ میں اپنی دو کتابیں لکھیں :

Irving had become absorbed in the legends of the Moorish past, and wrote his Conquest of Granada and Tales of the Alhambra (V/435)

واشنگٹن اروِنگ ۱۷۸۳ء میں نیویارک میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۵۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

الحمراء قلعہ اور محل دونوں تھا جس طرح دہلی کا لال قلعہ دونوں ہے۔ یہ اندلس کے مسلم حکمرانوں نے غرناطہ میں بنایا تھا۔ یہ قصر بنیادی طور پر ۱۲۳۸ اور ۱۳۵۸ کے درمیان بنایا گیا۔ ۱۴۹۲ء میں جب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت آخری طور پر ختم ہوئی تو یہ قصر بھی زد میں آیا۔ اس کے بعد کئی بار اس عمارت کو نقصان پہنچا۔ تاہم ۱۸۲۸ میں اس کی مرمت کر کے اس کو دوبارہ دل کش بنانے کی کوشش کی گئی۔

موجودہ الحمراء میں کچھ حصہ مسلمانوں کا بنایا ہوا ہے اور کچھ حصہ بعد کے عیسائی حکمرانوں کا۔

الحمراء کے ایک خاص حصہ میں سفید سنگ مرمر سے بنے ہوئے بارہ شیر ہیں۔ یہ گویا طاقت اور ہمت کی علامت ہیں۔ قصر کے اس حصہ کے مختلف نام ہیں —— فناء السباع ، دیوان الاسد ، مأسدة ، بیت الاسود۔

الحمراء صرف ایک محل نہیں ، وہ نہایت وسیع باغات کے درمیان بیرون شہر گویا ایک شاہی اقامت گاہ تھی۔ اس کی تعمیر پر بہت زیادہ دولت خرچ کی گئی۔ تاہم اس کا تعمیری سامان زیادہ مضبوط نہ تھا۔ اپنے عظیم حسن کے باوجود وہ غیر مستحکم تعمیراتی سامان کے ذریعہ بنی ہوئی ایک عمارت کہی جائے گی۔

الحمراء کے محلات اس وقت بنائے گئے جب کہ یہاں کی مسلم حکومت سمٹ کر صرف غرناطہ تک محدود ہو گئی تھی۔ اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ لال قلعہ کے حکمراں کی طرح وہ باہر سے مضبوط پتھر بڑی مقدار میں منگا سکے۔ وہ زیادہ مستحکم عمارت کھڑی نہیں کر سکتے تھے ، اس لیے شاید اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے زیادہ خوب صورت عمارتیں کھڑی کر دیں۔

قصر الحمراء ۲۲۰۰ مربع میٹر کے رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے ہر حصہ میں آیتیں ، حدیثیں ، دعائیں ، اشعار اور دوسری عربی عبارتیں لکھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ خاص طور پر بنو الاحمر کا خاندانی شعار وَلاغالبَ اِلااللہ اس کے ہر حصہ میں نقش کیا ہوا نظر آتا ہے۔

آخری دور کی سلطنت غرناطہ (۱۴۹۲ - ۱۲۳۲ء) کا بانی محمد بن یوسف الاحمر تھا۔ وہ ارجونہ کا قلعدار تھا۔ اس نے بغاوت کر کے غرناطہ پر قبضہ کر لیا ، اور اپنا لقب الغالب باللہ اختیار کیا۔ اسی سلطنت کے زمانہ میں غرناطہ کا مشہور قصر الحمراء تعمیر ہوا۔ اس خاندان (بنو احمر) کے حکمرانوں نے اسی لفظ کو اپنا شعار بنالیا۔ وہ عمارتوں وغیرہ پر کثرت سے وَلاغالبَ اِلااللہ لکھا کرتے تھے۔

اقبال ۱۹۳۳ میں اندلس گئے تھے۔ واپسی کے بعد انھوں نے مختلف مواقع پر اپنے سفر کے تاثرات بتائے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا : میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا۔ مگر (انسانوں سے خالی اس قصر میں) جدھر نظر اٹھتی ، دیوار پر ھوالغالب لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے۔ کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو۔ (اقبال یورپ میں ، از سعید اختر درّانی)

یہ احساس بڑا عجیب ہے ۔ میرا اپنا حال تو یہ ہے کہ مجھے انسانوں کی بھیڑ میں بھی خدا ہی دکھائی دیتا ہے اور وہاں بھی میرے اندر ہیبت ناجی ربہ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ۔ مگر اقبال خدا کے ذکر کے ہجوم میں کسی انسان کو تلاش کر رہے ہیں تاکہ اس سے وہ ہم کلام ہوسکیں ۔

پچھلے چودہ سو سال میں مسلم دنیا میں جو اہل دماغ پیدا ہوئے اس کی فہرست میں ابن خلدون کا نام ممتاز طور پر شامل ہے ۔ اس کا اسلوب تحریر اور اس کا طرز فکر دونوں انتہائی حد تک اوریجنل تھا۔ وہ ان چند مسلم اہل علم میں سے ہے جنھوں نے اپنے افکار کی آفاقیت کی بنا پر عالمی سطح پر اپنا اعتراف حاصل کیا، اگرچہ یہ عالمی اعتراف اس کو پانچ سو سال بعد مل سکا۔

ابن خلدون تیونس میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۰۶ء میں قاہرہ میں اس کی وفات ہوئی ۔ تاہم اس کی زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ اندلس میں گزرا۔ اور اگر اس کے حاسدین اور مخالفین نے اس کو اندلس چھوڑنے پر مجبور نہ کیا ہوتا تو اس کی قبر شاید قاہرہ کے بجائے قرطبہ یا غرناطہ میں ہوتی۔

پروفیسر چارلس اساوی (Charles Issawi) نے لکھا ہے کہ ——— ۱۸۶۰ء میں مقدمہ کا مکمل ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوا، اس کے بعد ہی ایسا ہوا کہ ابن خلدون کو اپنی عظیم حیثیت کے مطابق عالمی مقام ملے :

> But it was only after the 1860s, when a complete French translation of *The Muqaddima* appeared, that Ibn Khaldun found the worldwide audience his incomparable genius deserved. (9/149)

ایک مستشرق نے اپنا ایک مقالہ دکھایا۔ اس کا ایک حصہ ابن خلدون کے بارہ میں تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ عباسی خلافت کے بعد اسلامی حکومت کا آرتھوڈاکس پولیٹکل نظریہ ایک بحران کا شکار ہوگیا۔ ابن خلدون نے سیاسی ڈھانچہ کے مقابلہ میں سماجی اور طبیعیاتی طاقتوں کی اہمیت پر زور دیا۔ اس نے عباسی خلافت کے تحت کلاسیکل سیاسی اتحاد کے تصور کو رد کر دیا ۔ البتہ اس نے تمام مسلمانوں کے روحانی اتحاد کا اقرار کیا :

> He rejected the classical political unity under the Abbasid Caliph but admitted the spiritual unity of all Muslims.

مذکورہ فرانسیسی مستشرق نے پوچھا کہ ابن خلدون کے اس نظریہ کے بارہ میں آپ کی رائے کیا

ہے۔ میں نے کہا کہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کو صحیح مانتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح یورپی نوآبادیات کے زمانہ میں سفید فام کی ذمہ داری (White man's burden) کا نظریہ اس کی تبریر کے لیے گھڑا گیا، اسی طرح عباسی دور میں عالمی خلافت کا نظریہ اس کی مذہبی حمایت کے لیے وضع کیا گیا۔ قرآن وسنت میں وہ سراسر اجنبی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق، روحانی ترقی اور روحانی اتحاد مسلمانوں کی مستقل ذمہ داری ہے اور سیاسی اقتدار صرف ایک عارضی خدائی انعام۔

میں نے کہا کہ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آج مسلم دنیا قتل وخوں ریزی کا کارخانہ بنی ہوئی ہے۔ مصر اور الجزائر سے لے کر بوسنیا اور کشمیر تک اسی بے بنیاد سیاسی نظریہ کے تحت بے فائدہ جنگ جوئی کا عمل جاری ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ہر جگہ مذہبی، روحانی اور دعوتی مواقع حاصل ہیں مگر وہ ان کو استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ وہ بس سیاست کی چٹان پر اپنا سر پٹک رہے ہیں، کیونکہ اپنی غلط سوچ کی بنا پر انھیں اس کے سوا کوئی اور کام کام دکھائی نہیں دیتا۔

میری پسندیدہ تفسیروں میں سے ایک خاص تفسیر الجامع لاحکام القرآن ہے۔ یہ تفسیر اسپین (قرطبہ) میں لکھی گئی۔ اس کے مولف ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری ہیں۔ وہ قرطبہ کے ایک بڑے عالم تھے۔ اسی لیے وہ القرطبی کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے ۶۷۱ھ میں وفات پائی۔

القرطبی کا فقہی مسلک مالکی تھا۔ مگر اپنی بے تعصبی کی بنا پر انھوں نے کئی جگہ امام مالک کے مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مالک نماز میں بچہ کی امامت کو ناجائز بتاتے ہیں۔ مگر القرطبی اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بچہ کا نماز میں امام بننا جائز ہے جب کہ وہ قرآن کی قرأت کرنا جانتا ہو (امامة الصغير جائزة إذا كان قارئا) تفسیر القرطبی ۱/۳۵۳

اسی طرح امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ رمضان میں روزہ رکھنے والا ایک شخص اگر بھول کر کھالے تو اس کو قضا کا روزہ رکھنا ہوگا۔ مگر القرطبی اس رائے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام مالک کے سوا دوسرے فقہاء کے نزدیک بھول کر کھانے والے کے اوپر روزہ کی قضا نہیں ہے، اور میں کہتا ہوں کہ یہی مسلک صحیح ہے (قلت وهو الصحيح) تفسیر القرطبی ۲/۳۲۲

موجودہ زمانہ میں علمی ذوق اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آدمی یا تو کلی موافق ہو سکتا ہے یا کلی مخالف۔ اگر کوئی شخص، مثال کے طور پر، ایک جماعت کو مفید جماعت بتائے مگر اس کے

بعض طریقوں سے وہ اختلاف کرے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص مصلحت پرست ہے۔ اصل میں تو وہ اس جماعت کا مخالف ہے، مگر مفاد کی بنا پر وہ اس کی تعریف کر رہا ہے۔

مسلم اسپین میں پیدا ہونے والی علمی شخصیتوں میں سے ایک ممتاز شخصیت ابو القاسم الزہراوی (Abulcasis) کی ہے۔ اس کی کتاب التصریف لاطینی زبان میں ۱۴۹۷ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد یورپ کی تمام اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب تقریباً ۵۰۰ سال تک اہل یورپ کے لیے طب اور سرجری میں مرجع بنی رہی۔ ہٹی کے الفاظ میں، اس نے یورپ میں جراحی کی بنیاد قائم کرنے میں مدد دی:

It helped lay the foundations of surgery in Europe. (p. 577)

زہراوی سے پہلے سرجری (جراحی) کا کام پچھنہ لگانے والے کیا کرتے تھے وہ اصول طب اور علم تشریح الاعضاء کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض اپنے خاندانی رواج کے تحت جراحی کا کام کرتے تھے اور اکثر مریضوں کو سخت نقصان پہنچاتے تھے۔ زہراوی نے جراحی (آپریشن) کو علم تشریح الاعضاء کی بنیاد پر قائم کیا، اس نے انسانی جسم کا گہرا مطالعہ کرکے اس کے اصول مقرر کیے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ پہلے تم انسانی جسم کا تشریحی مطالعہ کرو اور یہ جانو کہ وریدیں اور شریانیں اور اعصاب کہاں واقع ہیں، اس کے بعد جراحی کا کام کرو۔ اس نے مشاہدہ اور تجربہ کو جراحی کا لازمی حصہ قرار دیا۔ زہراوی نے فن جراحت میں بہت سی نئی نئی باتیں دریافت کیں۔

مسلم اسپین کی تاریخ میں ہر قسم کی سبق آموز مثالیں موجود ہیں۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں میں سے ایک نامور حکمراں سلطان عبد الرحمٰن الثالث ہے۔ وہ ۳۰۰ھ میں قرطبہ کے تخت پر بیٹھا۔ اور پچاس سال تک حکومت کی۔ اس کا زمانہ سلطنت ہر اعتبار سے نہایت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ یہی سلطان ہے جس نے مشہور قصر الزہراء تعمیر کرایا تھا جو اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ عالی شان محل سمجھا جاتا تھا۔ مگر زمانہ نے اس محل کو اس طرح مٹایا کہ آج آپ قرطبہ جائیں تو وہاں آپ کو اس کے صرف کھنڈر دکھائی دیں گے۔

قصر الزہراء میں آرام وعیش اور شان وشوکت کی تمام ممکن چیزیں اکٹھا کی گئی تھیں۔ ۳۵۰ھ میں اسی قصر شاہی میں عبد الرحمٰن الثالث کا انتقال ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں

ایک کاغذ ملا۔ اس میں سلطان نے اپنے ان دنوں کا حال خود اپنے قلم سے لکھا تھا جو غم سے خالی تھے۔ مگر پچاس سالہ دورِ حکومت میں ایسے بے فکری کے ایام کی تعداد صرف چودہ دن تھی۔

سلطان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا الحکمؒ بن عبدالرحمٰن قرطبہ کے تخت پر بیٹھا۔ قصر الزہرا، جو اس کے باپ نے بے پناہ محنت اور لاتعداد دولت کے ذریعہ بنایا تھا اس کو وراثت میں مل گیا۔ اس نے اپنا شاہی لقب المستنصر باللہ اختیار کیا۔

الحکمؒ نے پندرہ سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ مگر اس کے بھی آخری ایام مایوسی کے ایام تھے۔ کیوں کہ آخری زمانہ میں وہ مفلوج ہو گیا اور فالج کی حالت ہی میں ۳۶۶ھ میں قرطبہ میں اس کا انتقال ہو گیا (توفی بقرطبة مفلوجاً)

قصر الزہرا نہایت خوب صورت ہونے کے ساتھ بہت بڑا تھا۔ اسی لیے اس کو مدینۃ الزہراء کہا جاتا تھا۔ اس میں تفریح اور عیش کے تمام اسباب اکٹھا کیے گئے تھے۔ وہ چالیس سال میں بن کر تیار ہوا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس کے جلد ہی بعد زوال شروع ہوا، اور تعمیر کے بعد چالیس سال سے بھی کم مدت میں وہ کھنڈر ہو کر رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی منذر نے اس کی بابت یہ شعر کہے تھے کہ اے زہراء کو بنانے والے جو اپنے وقت کو اس میں غرق کیے ہوئے ہے، کیا تم ٹھہر کر غور نہیں کرتے۔ وہ کتنا زیادہ خوب صورت ہے، بشرطیکہ اس کی رونق پژمردہ نہ ہوتی :

یا بانی الزهراء مستغرقا اوقاته فیها اَما تمهل

لله ما احسنها رونقا لو لم تکن زهرتها تذبل

اندلس میں عربوں نے جو سیاسی نظام قائم کیا وہ اس طرح تھا کہ ایک ان کا مرکزی سلطان یا خلیفہ ہوتا تھا اور مختلف علاقائی حصوں میں ماتحت امیر ہوا کرتے تھے جن کو آج کل کی زبان میں گورنر کہا جاسکتا ہے۔ ابتداءً کئی سو سال تک عربوں میں سے امراء مقرر کیے جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ خیال تھا کہ وہ ہم نسل ہونے کی بنا پر زیادہ قابل اعتماد ثابت ہوں گے۔

مگر اس دنیا میں ہمیشہ ہر دوسری چیز پر انٹرسٹ فائق ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاسی انٹرسٹ نے ان امراء کے اندر بغاوت کا رجحان پیدا کیا۔ ہر عرب اپنے علاقہ کو مرکز سے الگ کر کے خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں مرکزی سلطان اور امراء کے درمیان لڑائیاں جاری ہو گئیں۔

عبد الرحمٰن الثالث نے اس پالیسی کو بدلا۔ اس نے عرب امرار کا زور توڑنے کے لیے بربر قبائل میں سے امیر اور وزیر مقرر کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں یہ لوگ بہت وفادار رہے۔ کیوں کہ امیر اور وزیر کے عہدے ان کی توقعات سے بہت زیادہ تھے۔ مگر دھیرے دھیرے جب وہ دولت اور اقتدار سے آشنا ہو گئے تو ان کے ذہن میں بھی بغاوت کے خیالات پرورش پانے لگے۔ عبد الرحمٰن الثالث کی زندگی تک تو یہ لوگ دبے رہے۔ مگر اس کی موت کے بعد وہ سب کے سب سرکش بن کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے راجدھانی قرطبہ پر حملے کیے۔ قصر الزہرا کو تباہ کر ڈالا۔

ہر شہر اور ہر علاقہ کا امیر مرکز کا باغی ہو گیا۔ حتیٰ کہ اندلس میں تقریباً دو درجن چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ جن کو الگ الگ فتح کرنا عیسائیوں کے لیے آسان ہو گیا۔

سرکشی اور بغاوت کا تعلق عرب اور غیر عرب سے نہیں ہے، اس کا تمام تر تعلق انٹرسٹ سے ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے انٹرسٹ کی طرف دوڑتا ہے۔ اسی سے انتشار اور بغاوت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے روکنے والی چیز صرف تقویٰ ہے، اور ایسا تقویٰ کسی بہت خوش نصیب آدمی ہی کو ملتا ہے جو انٹرسٹ کے خلاف اس کے لیے چیک بن جائے۔

روایت کو توڑنے سے کتنی بڑی خرابی آتی ہے، اس کی بہت سی مثالیں اسپین کی مسلم تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً سلطنت غرناطہ کا تیسرا حکمراں محمد مخلوع تھا۔ اس کو اس کے بھائی نصر بن محمد نے ۷۱۰ھ میں قتل کرا دیا تاکہ اس کا کوئی سیاسی رقیب باقی نہ رہے۔ مگر یہ جان کے احترام کی روایت کو توڑنا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد حکمرانوں کے قتل کا لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس کے بعد سلطان ابو الولید کو اس کے بھتیجے نے ۷۲۵ھ میں قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد سلطان محمد غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس کو بھی اس کے رشتہ داروں نے ۷۳۳ھ میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد سلطان یوسف کو حاکم بنایا گیا۔ مگر وہ بھی ۷۵۵ھ میں نیزہ مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر سلطان اسماعیل تخت نشین ہوا۔ مگر ۷۶۱ھ میں خود اس کے بھائی نے اس کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ

کسی سماج میں یہ روایت قائم کرنا ہو کہ انسانی جان کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اور اس کو کسی حال میں قتل نہیں کرنا چاہیے، تو یہ روایت ایک لمبی تاریخ کے بعد بنے گی۔ مگر اس روایت کو توڑنے کے لیے کسی مدت کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی روایت ایک بار توڑ دی جائے تو پھر اس کو از سر نو

قائم کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ روایت شکنی کے اسی خطرہ سے حدیث میں اس طرح آگاہ کیا گیا تھا کہ :

اذا وُضع السیفُ فی امتی لم یُرفع عنہا الی یوم القیامۃ (ابوداؤد، کتاب الفتن)

سقوط اندلس پر بہت سے شاعروں نے مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں زیادہ تر فریاد و ماتم کا انداز ہے۔ تاہم مجھے ابو علی الحسن بن رشیق کے دو شعر بہت پسند ہیں۔ اس نے کہا کہ اندلس کی سرزمین میں جو چیز مجھے بے لطف کرتی ہے ان میں سے معتمد (جس پر اعتماد کیا جائے) اور معتضد (نہایت مضبوط) جیسے القاب ہیں۔ یہ شاہانہ القاب اسی طرح غیر واقعی ہیں جیسے کوئی بلی نتھنے پھلا کر شیر کی صورت کی نقل کرنے لگے :

مِمّا یُزَهِّدُنی فی ارضِ اَندَلُسٍ اسماءُ مُعْتَمِدٍ فیہا وَمُعتَضِدِ

القابُ مملکۃٍ فی غیرِ موضِعِہا کَالہِرِّ یَحکِی انتفاخاً صورۃَ الاَسَدِ

یہ دونوں شعر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں خلافت کی بحث کے تحت نقل کیے ہیں (صفحہ ۲۲۹)

ایک حاکم کو جب سادہ طور پر امیر المومنین کہا جائے تو اس کے نہ رہنے سے لوگوں میں صرف یہ احساس پیدا ہوگا کہ ہمارا سیاسی حاکم نہ رہا۔ لیکن اگر اس کو جہاں پناہ اور محافظ اسلام جیسے القاب سے یاد کیا جانے لگے تو اس کے ہٹنے کے بعد لوگوں کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ آخری طور پر لٹ گئے۔ اب ان کے پاس قیام حیات کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔

مسلم اسپین صرف تمدنی ترقی ہی کی مثال نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ وہ رواداری کی بھی نہایت اعلیٰ مثال تھا۔ عرب اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت فیاض اور روادار واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ وہاں کے کام کی نوعیت یہ تھی کہ مسلم اہل علم کے ساتھ یہودی اور عیسائی اہل علم اور فن کار بھی مساوی طور پر شریک رہتے تھے۔ اس طرح اشتراک عمل کے ماحول نے باہمی رواداری کا ماحول بھی اپنے آپ پیدا کر دیا تھا۔

فرانسیسی مستشرق رینان (Renan) نے ابن رشد پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سائنس اور لٹریچر کے ذوق نے دسویں صدی میں دنیا کے اس خصوصی گوشہ میں رواداری کا ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کا نمونہ موجودہ زمانہ میں مشکل سے کہیں مل سکتا ہے۔ مسیحی، یہودی اور مسلمان ایک ہی زبان (عربی) بولتے تھے۔ ایک ہی گیت گاتے تھے۔ ایک ہی طرح ادبی اور علمی مطالعہ میں حصہ لیتے تھے۔ وہ تمام

رکاوٹیں جو لوگوں کو الگ الگ کرنے والی ہیں، وہ سب وہاں ختم کر دی گئی تھیں۔ تمام کے تمام لوگ ایک مشترک تہذیب کے لیے مل کر کام کرتے تھے:

The taste for science and literature had, by the tenth century, established, in this privileged corner of the world, a toleration of which modern times hardly offer us an example.

اب سوال یہ ہے کہ جب مسلم اسپین میں اتنا زیادہ رواداری کا ماحول تھا، پھر کیوں ایسا ہوا کہ وہاں کے مسیحی باشندے مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور ان کو وحشیانہ طور پر اپنے ملک سے نکالنا شروع کر دیا۔ اس کا سبب جو اس سفر کے بعد میرے علم میں آیا وہ یہاں کے مذہبی طبقہ کا جنون تھا۔

اصل یہ ہے کہ مسلم اسپین کے روادارانہ ماحول کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسپین کے مسیحی باشندے خود بخود کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ بہت سے لوگ جنھوں نے اپنا مذہب نہیں بدلا، انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب اختیار کر لی۔ چنانچہ ان کو مستعرب (Mozarab) کہا جانے لگا۔

مسیحی چرچ کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ مسلمانوں کے ذریعہ اسپین میں علوم کے دروازے کھلنا، زراعت، صنعت، تعمیرات اور دوسرے شعبوں میں غیر معمولی ترقی، سماجی زندگی میں انصاف اور رواداری کا آنا، اس قسم کی تمام مثبت چیزیں ان کے لیے غیر اہم بن گئیں۔ ان کو صرف یہ یاد رہا کہ ان کے ہم مذہب تیزی سے غیر مسیحی تہذیب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے اسپین کے مسیحیوں کو مسلمانوں سے روکنا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں اور مسیحیوں میں دوری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر میں انھوں نے وہ مجنونانہ تدبیر اختیار کی جس کو عام طور پر رضاکارانہ شہادت (voluntary martyrdom) کہا جاتا ہے (ہسٹری آف دی عربس، اڈیشن ۱۹۷۰، صفحہ ۵۱۶)

انھوں نے مسلمانوں کی نفسیات کا مطالعہ کر کے یہ نکالا کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے خلاف باتوں کو سن کر بگڑ جاتے ہیں اور ایسے آدمی کو قتل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سڑکوں پر نکل کر علی الاعلان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی اور بدگوئی شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان مشتعل ہو کر انھیں قتل کر ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں کو بدنام کر کے مسیحیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متنفر کر دیا جائے۔

اس انوکھی تدبیر کا چیمپین اسپین کا بشپ ایولوجیس (Eulogius) تھا۔ اس نے قرطبہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بار بار علی الاعلان سب وشتم کیا۔ اس کے بعد علماء کے فیصلہ کے مطابق، سلطان عبدالرحمٰن دوم نے ۱۱ مارچ ۸۵۹ء کو اسے برسر عام قتل کرادیا۔

اس طرح ایک کے بعد ایک مسیحی چرچ کے افراد عوامی مواقع پر آکر شتم رسول کا فعل کرتے رہے، اور اس کے نتیجہ میں مسلم تلوار سے قتل کیے جاتے رہے۔ یہ واقعہ نویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں پیش آیا جو اس وقت مسلم اسپین کا مرکز تھا۔ یہ عقوبت جس کے اسباب خود مسیحی لوگوں نے پیدا کیے تھے، آخر کار ۵۳ مسیحیوں کے قتل تک جا پہنچی:

this persecution. provoked by the Christians themselves, took a toll of 53 victims. (17/415)

اس قسم کے مجنونانہ واقعات نے اسپین کے مسیحیوں، خاص طور پر وہاں کے مذہبی طبقہ کے دل میں مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت پیدا کردی۔ یہاں تک کہ چرچ کے لیے آسان ہوگیا کہ وہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج عام کا فتویٰ جاری کرسکے۔

حکیم احمد شجاع صاحب کا خیال تھا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں علوم عصریہ کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ اقبال کو خط لکھا۔ اقبال نے انھیں جواب دیا کہ ان مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ اگر یہ ملّا نہ رہے تو ہندستانی مسلمانوں کا وہی حال ہوگا جو اندلس میں آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود وہاں کے مسلمانوں کا ہوا (الفرقان، لکھنؤ، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴، صفحہ ۲۳)

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے یہ بالکل الٹی بات کہی۔ اندلس جیسا حال کسی مسلم قوم کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے علماء اجتہادی صلاحیت سے محروم ہو جائیں۔ اور اجتہادی صلاحیت سے محرومی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ وقت کے تقاضوں سے بے خبر ہوگئے ہوں۔

اندلس کے اصحاب چرچ نے جب "رضاکارانہ شہادت" کا فتنہ کھڑا کیا، اس وقت وہاں کے علماء اگر اجتہادی صلاحیت کے حامل ہوتے اور مسیحی دنیا کے حالات سے پوری طرح باخبر ہوتے تو وہ فتویٰ دیتے کہ یہ چرچ کی ایک نہایت گہری سازش ہے۔ اگر ہم ان کو قتل کریں تو ہم خود ان کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس لیے ہم کو انھیں قتل نہیں کرنا ہے بلکہ حکمت کے

ساتھ ان کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اور پھر وہ چرچ کی سازش کا توڑ اس طرح کرتے کہ اس کے جواب میں وہ تعارف اسلام کی پرامن مہم زور وشور کے ساتھ چلا دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسیحی عوام چرچ سے متنفر ہو کر تعلیمات محمدی کی طرف مائل ہو جاتے اور اتنی تیزی سے اسلام قبول کرتے کہ چرچ کی سازش برعکس طور پر اندلس میں مسلمانوں کی مزید تقویت اور استحکام کا سبب بن جاتی۔

علماء کی حکیمانہ تدبیر چرچ کے پادریوں کو عوام کی نظر میں دیوانہ کا درجہ دے دیتی۔ مگر ان کی ناقص رہنمائی نے ان پادریوں کو اندلس کے مسیحیوں کی نظر میں شہید اور ہیرو کا مقام عطا کر دیا۔ اور پھر وہ کچھ پیش آیا جو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

ایک یورپی اسکالر (مستشرق) نے اسپین میں مسلم سلطنت کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان میں داخل ہوئے تو ابتدائی مرحلہ میں طارق اور نُصیر نے بغداد کی مدد سے یہاں کی مسیحی فوجوں پر فتح حاصل کی تھی۔ مگر آخری مرحلہ میں مسیحی قوتوں کے مقابلہ میں وہ اپنے مرکز کی مدد سے محروم رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اندلس میں قائم ہونے والی مسلم خلافت بغداد کی خلافت کی حریف بن گئی تھی۔ اس نے کبھی بھی بغداد کی مرکزی خلافت سے مصالحت کی کوشش نہیں کی:

Rival caliphate of Cordova never reconciled itself to the central caliphate of Baghdad.

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ اموی جب عباسیوں کی دار وگیر سے بھاگ کر اندلس پہنچا تو اس وقت کے امیرانِ اندلس خطبۂ جمعہ میں بغداد کے خلیفہ کا نام لیتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے ابتداءً ایسا ہی کیا۔ مگر بعد کو اس نے خطبہ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کا نام لینا بند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا اس نے خاندان بنو امیہ کے ایک شخص عبدالملک بن نے اندلس میں اپنی حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں عبدالرحمٰن کی مدد کی تھی:

و هذا عبد الملك هو الذي ألزم عبد الرحمٰن بقطع خطبة المنصور وقال له، تقطعها وإلا قتلتُ نفسي- و كان قد خطب له

عبدالملک ہی نے عبدالرحمٰن کو مجبور کیا کہ وہ خلیفہ منصور کا نام خطبہ میں لینا بند کر دے۔ عبدالملک نے کہا کہ تم اس کو بند کرو ورنہ میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن نے اس کا خطبہ

عشرہ اشھر، فقطعھا۔ پڑھنا بند کر دیا حالاں کہ دس مہینہ تک اس نے خلیفہ بغداد ہی کا خطبہ پڑھا تھا۔

(الکامل فی التاریخ لابن اثیر ۶/۱۰)

خلیفہ المنصور کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے اندلس پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد سے آخر تک بغداد کی خلافت اور اندلس کی مسلم ریاست کے درمیان معاونت کے بجائے رقابت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ یہ رقابت صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اندلس کی مسلم سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

دکتور حسین مونس کا سفرنامہ رحلة الاندلس، حدیث الفردوس الموعود کے نام سے ۱۹۶۳ میں جدہ سے چھپا تھا۔ وہ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ادبی اور جذباتی انداز میں ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: لان موضوعہ یمس عاطفة المسلم و وجدان العربی (صفحہ ۹)

مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل اسپین ہم سے ایک بالشت زمین بھی سخت معرکہ اور دو طرفہ اموات کے بغیر حاصل نہیں کر سکے۔ پھر کیسے یہ کہا جاتا ہے کہ عرب اس زمانہ میں کمزور ہوگئے تھے۔ ان پر عیش پسندی چھاگئی تھی۔ پھر جواب دیتے ہیں کہ جو ہوا وہ یہ تھا کہ قسمت نے اندلس میں ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ڈھائی صدیوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں اٹھا جو قیادت اور سیاست اور تدبیر کا جامع ہو (الذی حدث ھو ان الحظ خاننا فی الاندلس۔ خلال ھذین القرنین ونصف القرن لم یظھر رجل واحد جامع لصفات الزعامة والقیادة والسیاسة والتدبیر) صفحہ ۱۶۶

اس جواب کے بعد دوبارہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری ڈھائی سو سال میں کیوں قائدانہ اوصاف کے لوگ پیدا نہیں ہوئے، جب کہ اس سے پہلے بار بار ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ کا تعلق دور زوال سے تھا نہ کہ افراد کی عدم پیدائش سے۔ یہ زوال ہر سلطنت اور ہر قوم پر آتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں۔

لکھنؤ کے عربی جریدہ الرائد (۱۰-۲۶ رمضان ۱۴۱۲ھ) میں الاستاذ انور الجندی کا ایک مضمون نقل کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا: ھذا واجبنا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم مسلمانوں کی آج شدید ترین ضرورت ہے کہ ہم اندلس کے المیہ کا مطالعہ کریں، کیوں کہ ہم پچھلے چالیس سال سے پھر اندلس کے

مشابہ بحران میں مبتلا ہو گئے ہیں (ونحن المسلمین الیوم فی اشد الحاجة الی دراسة مأساة الاندلس لاننا منذ اربعین سنة قد وقعنا فی ازمة قریبة الشبه بها)

اس کے بعد مضمون میں کہا گیا تھا کہ آج دوبارہ ایسے حالات درپیش ہیں جو ہم کو اندلس جیسے المیہ میں مبتلا کر دیں۔ کیوں کہ عالمی صہیونیت ہم کو وہیں دھکیل دینے کے لیے سرگرم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو مقدس جہاد کے لیے تیار کریں (لابد ان یقف المسلمون موقف الاستعداد و ان یدربوا الاجیال علی الجہاد المقدس)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو جہاد و قتال کا مسئلہ بتانا سراسر نادانی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فقدانِ جہاد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فقدانِ تقویٰ کا مسئلہ ہے۔ قرآن میں باربار بتایا گیا ہے کہ خدا متقیوں کے ساتھ ہے (التوبہ ۳۶) اگر تمہارے اندر تقویٰ ہو تو مخالفین کی سازشیں تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا ئیں گی (آل عمران ۱۲۰) گویا کہ تقویٰ دفاع کے لیے ایک موثر مددگار ہے۔

تقویٰ کا دفاعی قوت ہونا کوئی پراسرار بات نہیں، یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ آدمی کے اندر یہ صفت پیدا کرتا ہے کہ کسی کے ساتھ دشمنی ہو تب بھی وہ اس کے بارہ میں منصفانہ انداز میں سوچے، تب بھی وہ انصاف ہی کی بات کہے (المائدہ ۸) حریف کے بارہ میں درست رائے قائم کرنا ہی اس کے مقابلہ میں درست اور کارگر منصوبہ بندی کی واحد ضمانت ہے۔ اس طرح تقویٰ کا تعلق براہ راست طور پر دفاعی تدابیر سے جڑ جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں انڈیا کے ہندوؤں کی مثال لیجئے۔ ذاتی طور پر میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف نہیں سمجھتا بلکہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا ہم قوم سمجھتا ہوں۔ تاہم بہت سے مسلم رہنما اور مسلم دانش ور ہندوؤں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف دفاعی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر ان کی کوششیں نہ صرف ناکام ہیں بلکہ الٹا نتیجہ پیدا کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقدانِ تقویٰ کی وجہ سے وہ ہندو مسئلہ کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم پریس تقریباً بغیر استثناء ہندوؤں کو ظالم اور متعصب کے روپ میں دکھانے میں مصروف ہے۔ مثال کے طور پر مکہ کے ہفت روزہ اخبار العالم اسلامی کے شمارہ ۱۷ رجب ۱۴۱۵ھ (۱۹ دسمبر ۱۹۹۴) میں ہندستانی مسلمانوں کی فراہم کردہ ایک رپورٹ چھپی ہے۔

اس کا عنوان ہے کہ انڈیا کے ہندؤوں کا یہ منصوبہ ہے کہ وہ دہلی کی مسجدوں کو کھیل کود کے میدان میں تبدیل کر دیں (مخطط هندوسي لتحويل مساجد دلهي إلى ملاعب) اس رپورٹ میں دوسری مذموم کوششوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندستان کی ہندو حکومت یہ ارادہ رکھتی ہے کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر روک لگانے کے لیے مردوں کو جبری طور پر بانجھ بنا دے (ان حكومة الهند - الهندوكية - تعمد من اجل الحد من زيادة عدد المسلمين في الهند الى التعقيم الاجباري للرجال)

یہ بات سراسر لغو اور بے بنیاد ہے، مگر آج تمام مسلم دانشور اور رہنما ہندؤوں کے بارہ میں اسی قسم کے غیر واقعی اندازہ کا شکار ہیں۔ اور جو لوگ اپنے "حریف" کے بارہ میں غیر واقعی اندازہ کا شکار ہو جائیں وہ ان کے مقابلہ میں کامیاب منصوبہ بھی کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کانفرنس میں مسلمان بھی قابل لحاظ تعداد میں تھے۔ انڈیا اور پاکستان سے ایک ایک آدمی تھے۔ اس کے علاوہ مراکو، تیونس، مصر، سوڈان، سعودی عرب، فلسطین، ترکی، وغیرہ سے کافی لوگ آئے تھے۔ بہت سے پہلوؤں سے ان میں کافی فرق تھا۔ مگر ایک بات میں تقریباً سب کی سوچ ایک تھی۔ ہر ایک کے نزدیک موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس مظلومیت کا کیس تھا۔ ہر ایک کے نزدیک وہ غیر مسلم قوموں کی سازش اور زیادتی کا شکار ہو رہے تھے۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ کیوں کر اس انداز میں سوچتے ہیں۔ یہ تو خود دین اسلام کی تردید ہے۔ خدا کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اس دین کی اور اس کے حاملوں کی حفاظت فرمائے گا۔ پھر یہ تو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ ہم یہ خیال کریں کہ خدا نے کسی صلیبی یا صہیونی یا استعماری طاقت کو اس بات کا کھلا موقع دے دیا ہے کہ وہ ہم کو تباہ کر ڈالیں۔

آپ لوگوں کو اس کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ کچھ متعصبین نے اندلس میں مسلمانوں کا خاتمہ کرنا چاہا تھا مگر وہ ان کا خاتمہ نہ کر سکے۔ اسلام دوبارہ یہاں نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا۔ اسی طرح ساری دنیا میں مخالفین کی سازشیں ناکام ہو کر رہ جائیں گی۔

میں نے کہا کہ اندلس کے تجربہ کے ذریعہ خدا ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ اے پیروان محمد، تم لوگ عزم اور ہمت کے ساتھ توحید کے مشن کو دنیا میں پھیلاؤ۔ میں لوگوں کے مقابلہ میں

تمہاری یقینی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں (واللہ یعصمک من الناس)

غرناطہ اسلام کی توسیع کی تاریخ میں ایک علامتی لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے اپنے لکچر (۸ مئی ۱۸۴۰) میں پیغمبر اسلام کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ گویا ایک چنگاری اوپر سے گری، ایک ایسے ملک میں جو بظاہر تاریک اور ناقابل لحاظ تھا، مگر دیکھو، یہ ریت اس طرح جل اٹھی کہ دہلی سے غرناطہ تک سب روشن ہوگیا:

It is not as if a spark had fallen, one spark, on a world of what seemed black unnoticeable sand; but lo, the sand proves explosive powder, blazes heaven-high from Delhi to Grenada. (p. 71)

اس "روشنی" کو جو لوگ سیاسی اقتدار کے معنی میں لیتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ روشنی ایک مدت تک جلنے کے بعد بجھ گئی اور صدیوں سے وہ جزئی یا کلی طور پر بجھی ہوئی ہے، مگر یہ معیار درست نہیں۔ میں اس روشنی کو فکری اور روحانی معنی میں لیتا ہوں۔ اس لیے مجھ کو آج بھی یہ روشنی جلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، نہ صرف دہلی سے غرناطہ تک، بلکہ زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک۔

جو لوگ جدید حالات کے پس منظر میں اندلس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس موضوع پر ۱۹۹۱ میں عربی میں ایک معلوماتی کتاب چھپی ہے۔ ۱۶۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام و پتہ یہ ہے:

الصحوة الاسلامية فى الاندلس اليوم، تاليف د۔ على المنتصر الكتانى

مركز البحوث والمعلومات، ص ب ۸۹۳، الدوحة، قطر

مصنف جو اسپین کے پڑوسی ملک المغرب سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے کافی تلاش و تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود اسپین سے مسلمان کبھی ختم نہیں ہوئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے عجیب واقعات لکھے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ الغرناطی نام کے ایک شخص سے میری ملاقات کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں ۵ نومبر ۱۹۷۲ کو ہوئی۔ اس کی پیدائش برشلونہ میں ہوئی تھی۔ پھر اس نے پاکستان میں ۱۹۶۹ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو میری دادی نے اپنی موت کے وقت مجھے اپنے قریب بلایا اور سرگوشی کے انداز میں میرے کان میں کہا کہ عیسائی دین ہمارا دین نہیں ہے۔ اور وہ سچا دین بھی نہیں۔ جب تم بڑے ہوجاؤ تو

اپنے دین کو جاننے کی کوشش کرنا (ان الـدین النصرانی لیس دیننا و لیس ھوالـدین الحق - عنـد ما تکبر حاول ان تعرف دینک) صفحہ ۸۸

الغرناطی نے بڑے ہونے کے بعد اسپین کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ اور پھر وہ اپنی دادی کی بات کو سمجھ گیا اب اس نے دین اسلام کو جان لیا اور اس پر مطمئن ہوگیا اور پاکستان جاکر اپنے اسلام کا اعلان کردیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین کے بہت سے لوگوں نے اس طرح دوبارہ اپنے اسلام کا اعلان کیا ہے۔

مسلم دانشوروں کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ بلاتحقیق بڑی بڑی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے اس مزاج کا اظہار اسپین کے معاملہ میں بھی بار بار ہوتا رہا ہے۔ مثلاً بمبئی کے ماہنامہ البلاغ (فروری ۱۹۹۵) میں ایک صاحب اسپین کے تذکرہ کے تحت لکھتے ہیں کہ "یہ بھی تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ جس اسپین پر مسلمانوں نے باضابطہ طور پر ۱۴۹۲ء تک حکومت کی، وہاں آج ایک مسلمان نہیں" (صفحہ ۵۳) مگر جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔

اس قسم کی خلاف حقیقت باتیں مختلف عنوانات کے تحت اتنی زیادہ چھپی ہیں کہ اس نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر بے ہمتی میں مبتلا کردیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ اس قسم کی منفی باتوں کی مسلسل تکرار نے موجودہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا ہے کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے۔ ہر طرف ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہر قوم ان کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

قوموں کی اس وہمی تصویر نے مسلمانوں سے ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ان سے چھین لیا ہے۔ اور وہ دنیا کی قوموں کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ دعوت مسلمان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ مگر دعوت کا عمل انجام دینے کے لیے مدعو کے حق میں خیر خواہی درکار ہے، مسلمانوں کے دل میں دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی نہیں، اس لیے ان کے یہاں اسلام کی داعیانہ طاقت کا استعمال بھی نہیں۔

عجیب بات ہے کہ اسپین کے سفر سے کچھ پہلے ہندستان کے ایک مشہور عالم اور بزرگ کا خط (۴ اکتوبر ۱۹۹۴) مجھ کو ملا۔ موصوف نے اس میں مجھ کو کچھ مشورے دیے تھے۔ اور آخر میں اپنے مشورہ کی اہمیت و ضرورت کو بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ ——— "اس لیے کہ اس ملک کو اندلس ثانی

بنانے کی بڑی منظم کوشش کی جا رہی ہے۔"

ہندستان اور اندلس دونوں سے تفصیلی واقفیت کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات دہرا نا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جہاں تک اندلس کا تعلق ہے، وہاں ہر قسم کی جارحیت کے باوجود کبھی بھی اسلام یا مسلمانوں کا وجود ختم نہیں کیا جا سکا تھا۔ اور اب تو وہاں دوبارہ اسلام اس شان کے ساتھ آ رہا ہے کہ الصحوۃ الاسلامیۃ فی الاندلس الیوم جیسے ٹائٹل کے ساتھ کتابیں چھپ رہی ہیں۔ پھر جب خود اندلس اول نہیں بن سکا تو اندلس ثانی آخر کیوں کر بن جائے گا۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے تو یہاں مسلمانوں کو یقیناً کچھ مسائل کا سامنا ہے۔ مگر یہ مسائل کسی نہ کسی صورت میں ہر جگہ ہیں، حتیٰ کہ مسلم ممالک میں بھی۔ اصل یہ ہے کہ مسائل زندگی کا جزء ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مسائل کو چیلنج کے روپ میں لیں۔ نہ یہ کہ "اندلس ثانی" کا فرضی خطرہ بتا کر مسلمانوں کو پست حوصلہ کریں۔

دور اول میں مسلمانوں کو پہلے غزوۂ بدر میں فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد غزوۂ احد میں ان کو شکست ہو گئی۔ اس پر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوئے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عسکری یا سیاسی فتح کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں ہے۔ وہ مختلف مصالح کے تحت مختلف قوموں کو باری باری دی جاتی ہے:

إن يمسسكم قرح فقد مس القوم قرح مثله وتلك الايام نداولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰)	اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔ اور (فتح و شکست کے) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔

اسپین کی سیاسی شکست کے معاملہ میں اور موجودہ زمانہ میں اس قسم کی دوسری شکستوں کے معاملہ میں ہمارے علماء اور دانشور جس طرح تبصرہ کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے اہل علم کا پورا طبقہ اس آیت کو بھول گیا ہے۔ ہمارے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے اس طرح کی سیاسی شکستوں کو اعداء اسلام کی سازش کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ قرآن کے مطابق، ایسے تمام واقعات خود خدا کے فیصلہ کے تحت پیش آتے ہیں۔ وہ ایام الاعداء نہیں ہیں بلکہ وہ ایام اللہ ہیں۔

طرز فکر کا یہ فرق بے حد فیصلہ کن ہے۔ سیاسی فتح و شکست کے واقعات کو اگر ایام الاعداء سمجھا جائے تو اس سے فریاد اور احتجاج کا ذہن بنتا ہے۔ جو صرف مزید نقصان کا باعث ہے۔ اس کے برعکس اگر ان واقعات کو ایام اللہ سمجھا جائے تو قوانین فطرت پر غور کرنے کا مزاج بنے گا۔ پیش آنے والے مسئلہ کو ظلم کے بجائے چیلنج کے روپ میں لیا جائے گا۔ لوگوں کی ساری توجہ اپنی کمیوں کو دور کرنے اور از سر نو زیادہ موثر منصوبہ بندی میں لگ جائے گی۔ یہاں تک کہ ہاری ہوئی بازی دوبارہ نئی شان کے ساتھ جیت لی جائے گی۔ یہی مطلب ہے و انتم الاعلون ان کنتم مومنین کا۔

اُردن کے عربی میگزین (الاجنحة (مارچ ۱۹۹۰) میں ایک بار میں نے ایک مصری خاتون لیما نبیل کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے اسپین کا سفر کیا تھا اور وہاں عرب دور کے پر عظمت آثار دیکھے تھے، انھوں نے لکھا تھا کہ یہاں میں نے تاریخ النصر العربی کو بھی دیکھا اور تاریخ الذل العربی کو بھی مضمون کے مطابق، انھوں نے رو کر اپنے آپ سے کہا کہ عرب کی یہ تاریک رات آخر کب تک باقی رہے گی (الی متی سیستمر ھذا اللیل العربی)

اس کے برعکس راقم الحروف نے جب اسپین کا سفر کیا تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسپین میں مسلم رات ختم ہوگئی اور وہاں صبح کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہر واقعہ میں تاریک رخ بھی ہوتا ہے اور روشن رخ بھی۔ آپ کے اندر منفی طرز فکر ہو تو آپ تاریک رخ کو دیکھیں گے اور مثبت طرز فکر ہو تو روشن رخ کو۔

۱۹۷۶ کے موسم خریف میں حکومتِ اسپین کے زیر انتظام ایک پانچ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کا عنوان تھا: المؤتمر الاول لتاریخ إسبانیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسپین کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی اس پہلی عالمی کانفرنس کے ایجنڈا میں جن شہروں کو خصوصی بحث و تحقیق کا موضوع بنایا گیا، ان میں نہ میڈرڈ کا نام تھا، جو موجودہ اسپین کا سیاسی مرکز ہے، نہ برشلونہ شامل تھا جو اسپین کے ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ صرف ان شہروں کے تاریخی و تہذیبی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا جن کا تعلق مسلم اسپین سے ہے یعنی اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حکومت اسپین کی نظر میں اپنے ملک کی تاریخ بے معنی اور بے وقعت ہو جاتی ہے اگر اس سے اسلامی دور کو حذف کر دیا جائے۔

مذکورہ کانفرنس میں ایک بڑا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا، اس کو ایک عرب دکتور مصطفےٰ الشکعہ نے بیان کیا ہے، جو اس میں شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شکاگو یونی ورسٹی کے نمائندہ ڈاکٹر اسمتھ (Dr Smith) نے کانفرنس میں جو مقالہ پیش کیا وہ اول سے لے کر آخر تک اسلام اور مسلمانوں کے اوپر جارحانہ حملہ تھا۔ حتی کہ اپنی بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ اسپین کے باشندوں نے جو سب سے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے یہاں سے عربوں اور مسلمانوں کو باہر نکال دیا (اعظم عملٍ قام بہ الإسبان ھو طرد العرب والمسلمین من إسبانیا) مناہج المستشرقین، الریاض ١٩٨٥، ٢/٢٧٦

اس کے بعد میڈرڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مونتابث کھڑے ہوئے اور نہایت پرزور الفاظ میں امریکی مستشرق کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے نہ تاریخ کو پڑھا ہے اور نہ اس کو سمجھا ہے۔ اگر وہ آٹھ سو سال نہ ہوتے جو اسپین نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے سایہ میں گزارے ہیں، تو ہمارا ملک کبھی تہذیبی تاریخ کے دور میں نہ داخل ہوتا۔ انھیں آٹھ صدیوں کی بدولت اسپین اس قابل ہوا کہ اپنے پڑوس کے یورپی ملکوں میں علم وثقافت کی روشنی پھیلائے جو اُس وقت جہالت، ناخواندگی اور پس ماندگی کے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے:

إنہ لم یقرأ التاریخ ولم یفہمہ.....إسبانیا ما کان لہا أن تدخل التاریخ الحضاري لولا القرون الثمانیۃ التي عاشتہا في ظلّ الاسلام وحضارتہ، وکانت بذلک باعثۃ النور والثقافۃ إلی الاقطار الأوروبیۃ المجاورۃ المتخبطۃ آنذاک في ظلمات الجہل والأمیۃ والتخلف (کتاب مذکور صفحہ ٢٧٧)

ڈاکٹر مونتابث مشہور اسپینی مستشرق فرانسیسکو کوڈیرا زیڈین (Francisco Codera Zaydin) کے شاگرد ہیں۔ کوڈیرا کا سال پیدائش ١٨٣٦ اور سال وفات ١٩١٧ ہے۔ وہ قدیم اسلامی تہذیب و روایات اور عربوں کی محبت سے سرشار تھا (لقد أُشرب کودیرا حبَّ العرب) کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق ایسے خانوادہ سے تھا جو اصلاً عرب تھا۔ جیسا کہ اسپین کے اکثر گھرانوں کا حال ہے۔ عربی زبان سے اس کو اتنا شغف تھا کہ وہ اپنے نام کا تلفظ عربی لہجہ میں اس طرح کرتا تھا: الشیخ فرنسیشکو قدارۃ زَیْدِین۔ امیر شکیب ارسلان اس کو کوڈیرا کے بجائے قدیرۃ کہتے تھے۔

کوڈیرا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ میڈرڈ یونی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے گزارا۔ وہ نہایت ذی علم، اعلیٰ ادبی ذوق اور انصاف پسند طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے اپنے زیر تربیت نوجوانوں میں اسپین کی مسلم تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ خود اس نے اس موضوع پر درجنوں ضخیم کتابیں اسپینی اور انگریزی زبانوں میں لکھی۔ اور اپنے بعض طلبہ کے تعاون سے بہت سے قیمتی عربی مخطوطات کی تحقیق کرکے ان کو جدید معیار کے مطابق (Bibliofica Arabico Hispana) کے نام سے شائع کیا۔ اس کی ذہنی وسعت اور انصاف پسندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ غلط ہوگا کہ اسپین کو یورپی بنانے کی کوشش کی جائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یوروپ کو عربی بنایا جائے (إن من الخطأ العمل على " أوربة " إسبانيا، بل الواجب هو " تعريب " أوروبا)

کوڈیرا کے زیر اثر اسپین میں اسکالروں کا ایک بڑا گروہ تیار ہوا، عربوں اور مسلمانوں کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر حد درجہ انصاف پسندی اور قدردانی پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اپنے استاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے آپ کو " بنی کوڈیرا " کہتے ہیں۔ جس سے عربی زبان کے ساتھ ان کے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

میڈرڈ کے شمال مغرب میں ایک شہر اِل اِسکوریال (El Escorial) ہے۔ یہاں سولہویں صدی کا ایک پرانا چرچ اور ایک تاریخی محل ہے۔ تاہم اس کی عالمی شہرت کا زیادہ بڑا سبب اس کی وہ عظیم شاہی لائبریری (مكتبة الإسكوريال الملكية) ہے، جس کا شمار دنیا کے قدیم اور مالدار ترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس لائبریری میں نادر عربی مخطوطات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے حتیٰ کہ یہاں پر بعض ایسے عربی مخطوطات محفوظ ہیں جو دنیا کے کسی بھی اسلامی یا غیر اسلامی کتب خانے میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اسپینی فقیہہ اور شاعر ابواسحاق الالبیری کا دیوان صرف اسکوریال میں ہے۔ جس کا کیٹلاگ نمبر ۴۰۴ ہے۔ یہاں کے عربی مخطوطات کی کئی ببلوگرافیاں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل دو زیادہ معروف ہیں :

1. Bibliotheca Arabic-Hespana Escurialens
by Miguel Casiri (Spanish)

2. Les manuscrits arabes de l'Escurial
by H. Derenbong (French)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب عربوں اور مسلمانوں کو اسپین سے نکالا گیا تو ان کی تمام کتابوں کو یا تو جلا دیا گیا یا دریا میں بہا دیا گیا۔ مگر اسکوریال کے کتب خانہ میں قدیم عربی مخطوطات کی موجودگی اس کی کھلی ہوئی تردید ہے۔

اسکوریال سے اسپینی زبان میں ایک مجلہ نکلتا ہے۔ اس کا نام الاسکوریال میگزین ہے۔ اس میں اکثر کسی نادر عربی مخطوطہ کی تحقیق ہوتی ہے۔ یا اندلس کے عرب سلاطین، وزراء، اطباء، شعراء، ادباء، فلاسفہ اور سائنس دانوں کے بارہ میں اسپینی اہل علم اور ریسرچ اسکالرس کے تحقیقی مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔

مسجد قرطبہ ایک دریا کے کنارے واقع ہے جس کو وادی الکبیر (Guadalquivir) کہا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم "مسجد قرطبہ" میں اس کے حوالے سے دو شعر کہے تھے جو یہاں قابل نقل ہیں :

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اقبال کا یہ خواب موجودہ زمانہ میں واقعہ بن رہا ہے۔ اب اسپین میں نئی اسلامی تاریخ بننا شروع ہو گئی ہے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں جس عمل کا آغاز ہو جائے وہ آخر کار اپنی انتہا تک پہنچ کر رہتا ہے۔

اسپین کے سفر پر روانگی سے چند دن پہلے ڈاک سے مجھے ایک کتاب ملی۔ ۸۵ صفحہ کی یہ انگریزی کتاب بمبئی (ہندو ویویک کیندر) سے چھپی ہے۔ اس کا نام ہے اسلام کا خطرہ :

B.N. Jog, Threat of Islam: Indian Dimensions,
1, Purvanchal, Navghar Marg, Bombay 400081

اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے مذہب اور کلچر کے ساتھ پر امن طور پر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اسلام کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، یعنی اسلام کا مکمل خاتمہ۔ اس معاملہ میں ساری دنیا کو اسپین کے نمونہ کو اختیار کرنا ہے۔ اسپین نے اسلام اور

مسلمانوں کو مکمل طور پر اپنے یہاں سے خارج کر دیا۔ اسی طرح ہندستان اور دوسرے ملکوں کو چاہیے کہ وہ ان کو اپنے یہاں سے خارج کر دیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

یہ بات اس مفروضہ پر کہی گئی ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے خارج کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات واقعہ کے مطابق نہیں۔ پھر جو اسپین خود اسپین میں نہیں بنا وہ دوسرے کسی مقام پر کیسے بن جائے گا۔

مصنف نے بالواسطہ انداز میں اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۲۵ میں آر ایس ایس کی تنظیم اسی خاص مقصد کے لیے بنائی گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ ۷۰ سال کی لمبی مدت میں آر ایس ایس نے کیا کیا۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۲۵ میں سارے برصغیر ہند میں مسلمانوں کی جو مجموعی تعداد تھی اس سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی آج صرف منقسم انڈیا میں ہے۔ گویا آر ایس ایس کی ساری کوششوں کے باوجود اسلام کا قافلہ برعکس سمت میں سفر کر رہا ہے۔

اب بیسویں صدی کے آخر میں جو لوگ اس قسم کی کتابیں چھاپ رہے ہیں وہ صرف نادانی کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اب زمانہ مزید سفر کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ انسان کو صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے سے دل چسپی ہے ——— کیریر بنانے والی کتابیں یا تفریحی کتابیں۔ اور مذکورہ بالا کتاب یقینی طور پر ان دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں آتی۔

یکم دسمبر کو یہاں سے واپسی کا دن تھا۔ صبح کو فجر کی نماز میڈرڈ کے ہوٹل میں پڑھی۔ مسلم عہد میں میڈرڈ کا علاقہ بھی مسلم سلطنت میں شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ اگرچہ ہوٹل کے اس کمرہ میں نہیں، مگر جہاں یہ ہوٹل کھڑا ہے، عین ممکن ہے کہ اس زمین پر اللہ کے کسی بندہ نے سجدہ کیا ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہاں کی فضائیں کسی مومن کی آہوں اور آنسوؤں کی امین ہوں۔

مسلم دور حکومت میں میڈرڈ کا نام مجریت (majrit) تھا۔ یہی لفظ بدل کر اب میڈرڈ بن گیا ہے۔ مسلم عہد کے ایک عالم فلکیات ابو القاسم مسلمہ (وفات ۱۰۰۷ء) میڈرڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کو المجریتی کہا جاتا ہے۔

دور قدیم میں یہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا قلعہ تھا۔ یہ قلعہ اب میڈرڈ میں موجود نہیں۔ مگر آج وہاں اس سے زیادہ شاندار ایک اسلامک سنٹر کھڑا ہوا ہے جو سعودی عرب کے مالی تعاون سے

بنایا گیا ہے۔ یہ موجودہ یورپ کا سب سے بڑا اسلامک سنٹر ہے۔ اس کی تعمیر پر ۲۰ ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ وہ ۲۰ ہزار اسکوائر میٹر رقبہ میں واقع ہے۔

قدرتی طور پر میری خواہش تھی کہ میں میڈرڈ کے اس اسلامی مرکز میں جاؤں اور اس کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھوں۔ مگر چاہنے کے باوجود میں وہاں جا نہ سکا۔ یکم دسمبر کو میڈرڈ سے روانگی کا دن تھا۔ مجھ کو اور کئی دوسرے لوگوں کو صبح کے وقت ایرپورٹ جانا تھا۔ منتظمین کانفرنس نے ہمارے لیے مشترک سواری کا انتظام کیا تھا۔ مگر میں مشترک سواری میں نہیں بیٹھا۔ اس کے بجائے میں نے یہ کیا کہ کچھ سویرے میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی لے کر روانہ ہوا۔

ٹیکسی والے سے میں نے کہا کہ تم مجھ کو سیدھے ایرپورٹ نہ لے جاؤ۔ بلکہ اسلامک سنٹر کی طرف سے گزارتے ہوئے ایرپورٹ لے چلو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میڈرڈ کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے آخر کار میں وہاں پہنچا جہاں خوب صورت اور عالی شان اسلامی مرکز اسپین کی سرزمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر میرا عجیب احساس ہوا۔ میں نے سوچا کہ ہندستان میں کچھ مسلم دانشور مسلمانوں کو ڈرا رہے ہیں کہ تمہارے دشمن ہندستان کو تمہارے لیے دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے ان مسلم دانشوروں کو یہ کہنا چاہیے کہ اے مسلمانو مطمئن رہو۔ جس دنیا میں پہلا اسپین بھی نہ بن سکا وہاں دوسرا اسپین آخر کیسے بنے گا۔

میڈرڈ کے اسلامی مرکز کے ڈائرکٹر اس وقت ڈاکٹر عبدالعزیز السرحان ہیں۔ انھوں نے رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے ۹۶-۱۹۹۵ کے لیے ایک دو سالہ منصوبہ بنایا ہے۔ اس دوران اساتذہ کی تربیت، عربی زبان کی تعلیم، اسلامی مسیحی ڈائیلاگ وغیرہ پر دگرام منعقد کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۹۹ میں امام ابن حزم کی یاد میں ایک بڑی کانفرنس کی جائے گی۔

میڈرڈ کے اس اسلامک سنٹر کا افتتاح ۲۴ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ (ستمبر ۱۹۹۱) میں ہوا۔ اسپین کے بادشاہ جان کارلوز (King Juan Carlos) نے اس کا افتتاح کیا۔ اس افتتاحی تقریب کی باتصویر رپورٹ المجلۃ (۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپی تھی۔ المجلہ نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا تھا کہ اسلام کا منارۂ اذان پانچ سو سال کے بعد پھر اسپین میں واپس آتا ہے (المئذنۃ الاسلامیۃ تعود الی اسبانیا بعد ۵۰۰ عام)

ریاض کے اخبار العالم الاسلامی (۴ اکتوبر ۱۹۹۲) نے یہ خبر اس عنوان کے ساتھ شائع کی تھی کہ میڈرڈ میں اسلامی ثقافتی مرکز کا افتتاح اسپین اور مسلمانوں کے لیے فخر کی بات ہے (افتتاح المرکز الثقافی الاسلامی فی مدرید مفخرة لاسبانیا والمسلمین) اس سنٹر میں مسجد، ہال، کالج، لائبریری قائم کیے گئے ہیں۔ نیز یہاں سے اسپینی زبان میں لٹریچر اور میگزین شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے ہال میں بیک وقت عربی، اسپینی، انگریزی زبانوں میں فوری ترجمہ کا انتظام ہے۔

شاہ اسپین نے (المجلہ کی رپورٹ کے مطابق) اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اسپین اپنے مسلم ماضی پر فخر محسوس کرتا ہے (اسبانیا تشعر بالفخر بماضیها)

ہندستان میں کچھ لکھنے اور بولنے والے مسلمان یہ انکشاف کرنے میں مشغول ہیں کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کچھ ہندو لیڈر اسپین گئے۔ اس سفر کا مقصد یہ جاننا تھا کہ اسپین سے کس طرح مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تاکہ آزادی ملنے کے بعد اسی عمل کو دہرا کر ہندستان کو دوسرا اسپین بنایا جا سکے۔

اسپین کی سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے یہ بات مضحکہ خیز حد تک بے معنی نظر آئی۔ ظاہر ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کا استیصال کوئی جاری عمل نہیں ہے جس کو کوئی شخص وہاں جا کر دیکھے۔ مسلمانوں کے خلاف جو کچھ بھی ہوا، وہ ماضی کا واقعہ ہے نہ کہ حال کا واقعہ۔ آج کے اسپین میں کہیں بھی کوئی شخص یہ نہیں دیکھ سکتا کہ مسلمانوں کے مفروضہ خاتمہ کے لیے وہاں کیا کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ آج صرف لائبریریوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کو اسپین کے محلوں اور شہروں میں ہوتا ہوا نہیں دیکھا جا سکتا۔

مزید یہ کہ آج کے اسپین میں جو شخص گھومے گا وہ بالکل برعکس تاثر لے کر واپس ہوگا۔ کیوں کہ آج وہ وہاں دیکھے گا کہ عبد الرحمٰن الداخل کو خود اہل اسپین نے دوبارہ تلوار بدست اپنی سرزمین پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ پائے گا کہ آج خود اسپین کی راجدھانی میں نہایت شاندار طور پر نئی مسجد اور نیا اسلامی مرکز بنایا گیا ہے۔ اس طرح آج وہاں جانے والا آدمی جگہ جگہ ایسے واقعات سے دو چار ہوگا جو اس کو بتائیں گے کہ اسپین کی پچھلی نسل نے اگر مسلمانوں کے خلاف زیادتی کی تھی تو اسپین کی موجودہ نسل اس قدیم پالیسی کو چھوڑ کر آج مسلمانوں کا استقبال کر رہی ہے۔ چنانچہ آج اسپین میں مسلمان قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں اور آزادانہ طور پر وہاں پر امن زندگی گزار رہے ہیں۔

صبح ۷ بجے ہوٹل سے نکلا۔ میڈرڈ کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی آخر کار ہماری گاڑی

ایرپورٹ پہنچ گئے۔ میڈرڈ کا ایرپورٹ دوسرے ترقی یافتہ شہروں کے ایرپورٹ کے مقابلہ میں کم منظم دکھائی دیا۔ مثلاً یہاں مجھ کو جو بورڈنگ کارڈ دیا گیا اس پر گیٹ کا نمبر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گیٹ نمبر عین بورڈنگ کے وقت مائک پر اناؤنس کیا جاتا ہے یا مخصوص بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے۔

میڈرڈ سے فرینکفرٹ کے لیے ایبیریا کی فلائٹ نمبر ۳۵۰۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز میں مطالعہ کے لیے صرف اسپینی زبان کے اخبارات تھے۔ اس لیے میں خلاف معمول دوران پرواز کسی اخبار کو نہ پڑھ سکا۔ جہاز مسافروں کو لیے ہوئے تیزی سے فضا میں اڑ رہا ہے اور مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو اب اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ اسپین جانے کا شوق تو یقیناً مجھے تھا مگر مجھ کو یقین نہیں تھا کہ میں کبھی اسپین کا سفر کر سکوں گا۔ بظاہر یہ ایک نہ ہونے والی بات نظر آتی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ میرے اسفار کا یہ خانہ بھی پورا ہو جائے۔ چنانچہ اچانک ایک روز ڈاک سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے بعد لمبا وقفہ پڑا اور وہاں سے مزید کوئی اطلاع نہیں ملی۔ دوبارہ اچانک آغاز سفر کے صرف دو دن پہلے ٹیلی فون پر وہاں سے بتایا گیا کہ میرے سفری کاغذات بھیج دیے گئے ہیں۔ اس کو ایر فرانس سے حاصل کرلیں۔

جہاز فرینکفرٹ کے قریب پہنچا تو پائلٹ نے مائک پر اعلان کیا کہ فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ٹرافک کی وجہ سے ہم تقریباً پندرہ منٹ تاخیر کے ساتھ لینڈ کر سکیں گے۔ ریلوے میں اگر اگلے اسٹیشن کی پٹری خالی نہ ہو تو ٹرین پچھلے اسٹیشن پر ٹھہرادی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز کے لیے فضا میں ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ہمارا جہاز فرینکفرٹ کے اوپر اس طرح منڈلانے لگا جس طرح چیل بعض اوقات فضا میں منڈلاتی ہے۔ کچھ دیر تک اس طرح منڈلانے کے بعد کسی قدر تاخیر کے ساتھ جہاز ہوائی اڈہ پر اُترا۔

یہ "فرق" زندگی کا ایک اصول ہے۔ ہوائی جہاز کا پائلٹ اگر اس فرق کو نہ جانے اور اگلے ایرپورٹ کی طرف سے میسج ملنے کے بعد وہ جہاز کو فضا میں ٹھہرادے۔ یا ٹرین کے ڈرائیور کو جب اگلے اسٹیشن کی طرف سے سگنل نہ ملے تو وہ گول دائرہ میں ٹرین کو گھمانے کا فیصلہ کرے تو یہ دونوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔ ایسے جہاز کا پائلٹ بھی اپنے جہاز کو تباہ کردے گا اور ایسی ٹرین کا ڈرائیور بھی اپنی ٹرین کو۔

فرینکفرٹ دنیا کے چند اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ شہر نہایت مہنگا ہے۔ مگر یہاں ہر قسم کی اعلیٰ سہولتیں موجود ہیں۔ فرینکفرٹ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عالمی نمائشوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں بہت بڑا نمائشی میدان ہے اور اس میں سال بھر مختلف قسم کی نمائش لگی رہتی ہے۔

۵ اکتوبر سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۴ تک یہاں عالمی بک فیر لگی تھی۔ اس میں عالمی اداروں نے اپنی مطبوعات برائے نمائش رکھی تھیں۔ یہ نمائش عام شہریوں کے لیے نہیں تھی۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تھی جو بک ٹریڈ میں ہیں۔ چنانچہ دنیا بھر سے پبلشر، ڈسٹری بیوٹر اور بک سیلر یہاں آئے تھے۔

ایک صاحب کے تعاون سے فرینکفرٹ کی اس نمائش میں الرسالہ بک سنٹر کا بھی ایک اسٹال رکھا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ثانی اثنین نے دہلی سے فرینکفرٹ کا سفر کیا تھا۔ الرسالہ کے اسٹال پر مختلف ملکوں کے بہت سے لوگ آئے اور لٹریچر کو پسند کیا۔ خاص طور پر انھیں اس بات پر حیرت تھی کہ ہندستان میں ایسی معیاری کتابیں چھپ رہی ہیں۔ کافی لوگوں نے لٹریچر طلب کیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف قرآن کے لیے خاص طور پر بڑی بڑی فرمائش نوٹ کرائیں۔

فرینکفرٹ جرمنی کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے۔ جرمنی کی ایک اہمیت یہ ہے کہ یہاں بہت سے بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ استشراق دراصل نوآبادیاتی دور کے ایک مظہر کے طور پر پیدا ہوا۔ چنانچہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ مگر بیسویں صدی میں اس قسم کے مستشرق نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب زیادہ اعلیٰ ذہن دوسرے علمی میدانوں میں چلے جاتے ہیں جہاں انھیں اپنی صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل سکتی ہے، وہ استشراق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی میں بھی بہت سے بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ تاریخ طبری کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ضائع ہو چکی ہے۔ لیکن جرمن مستشرق گڈ فریڈ سکارٹن نے اس کا مخطوطہ حاصل کیا اور برسوں کی محنت کے بعد اس کو درست کر کے شائع کیا۔ اسی طرح ایک اور جرمن مستشرق پروفیسر ساخو جس نے طبقات ابن سعد پر غیر معمولی محنت کر کے اس کو مکمل شائع کیا۔ وغیرہ

مستشرقین نے قدیم عربی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے میں انتہائی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ تاہم جہاں تک خود ان کی اپنی تحریروں کا تعلق ہے، اپنے علم کی وسعت کے باوجود انھوں

نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ذہنی پس منظر اسلام کے مطابق نہیں۔

مثلاً پروفیسر ہیملٹن گب (۱۹۷۱ - ۱۸۹۵) جو نسبتاً جدید مستشرق ہیں، وہ اچھی عربی جانتے تھے۔ انھوں نے حدیث میں پڑھا کہ بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب محمڈن ازم میں لکھ دیا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کو پہلے حنیفیۃ کہا تھا۔ بعد کو انھوں نے اس کا نام اسلام رکھا۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ پروفیسر گب کا ذہنی سانچہ ارتقائی تصور کے تحت بنا تھا نہ کہ اسلام کے تصور وحی کے تحت۔

اسپین میں مسلمانوں نے جس زمانہ میں شاندار تہذیب بنائی، اس زمانہ میں مواصلاتی ذرائع بہت محدود تھے۔ تاہم اس کی امتیازی خصوصیت کی بنا پر اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ جرمنی کی ایک خاتون شاعر رازوتھا (Hrosvitha) جو نن بھی تھی۔ وہ گینڈرشیم (Gandershsheim) میں ۹۲۵ء میں پیدا ہوئی، ۱۰۰۰ء میں اس نے انتقال کیا۔ اس جرمن شاعرہ نے غالباً اسپین کا سفر نہیں کیا تھا مگر قرطبہ کے بارہ میں اس نے بہت کچھ سنا تھا۔ اس کی ایک لاتینی نظم میں قرطبہ کے بارہ میں یہ الفاظ تھے کہ دنیا کا سب سے زیادہ شان و شوکت والا شہر:

Cordova, the brightest splendour of the world.

فرانس کی جانب جرمنی کی سرحد پر ایک تاریخی شہر ہے جس کا نام لارین (Lorraine) ہے۔ یہ شہر ۹۲۵ء میں جرمنی کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک وہ جرمنی کے قبضہ میں رہا۔ آج کل وہ فرانس میں شامل ہے۔

مسلم اسپین کے اثرات فرانس کے راستہ سے لارین تک پہنچے تھے۔ فلپ ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں لکھا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں عربی سائنس لارین پہنچی۔ اس کے اثر سے یہ علاقہ دو صدیوں تک ایک سائنٹفک سنٹر بنا رہا۔ قریب کے دوسرے علاقے بھی عرب علم کو قبول کرنے کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئے۔ لارین سے یہ علم جرمنی کے دوسرے حصوں تک پہنچ گیا۔ جرمن بادشاہوں کے سفیر اسپین کے مسلم حکمرانوں کے دربار میں جانے لگے۔ ۹۵۳ء میں عظیم جرمن بادشاہ اٹو اول (Otto I) نے جان نامی ایک شخص کو قرطبہ بھیجا۔ وہ وہاں تقریباً تین سال تک رہا۔ غالباً اس نے عربی زبان سیکھی اور واپسی میں اپنے ساتھ عربی کی سائنسی کتابیں لے آیا۔ اس طرح اسپین کا عرب علم پورے

مغربی یورپ میں پھیل گیا (صفحہ ۹۰ — ۵۸۹)

ایک اور مستشرق نے لکھا ہے کہ لیان یا نواری یا بارسلونہ کے مسیحی حکمرانوں کو جب بھی ایک سرجن یا آرکیٹکٹ یا ماسٹر سنگر یا ڈریس میکر کی ضرورت ہوتی تو وہ قرطبہ سے اس کی درخواست کرتے تھے۔ مسلم راجدھانی کی شہرت جرمنی تک پہنچ گئی تھی جہاں ایک جرمن نن نے اس کو دنیا کا ہیرا (Jewel of the World) قرار دیا۔ (صفحہ ۵۲۷)

رِلکے (Rainer Maria Rilke) مشہور جرمن شاعر ہے۔ وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ جرمن مستشرقین نے جن عربی کتابوں کے ترجمے جرمن زبان میں کئے تھے اور اسلام پر جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے کچھ کتابوں کو رِلکے نے پڑھا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا مگر وہ اسلام سے متاثر تھا۔

دکتور عبد الرحمٰن بدوی نے رِلکے پر عربی زبان میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں رِلکے کے ایک خط کا عربی ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ ایک مفصل خط ہے۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ جب سے میں نے قرطبہ کا سفر کیا ہے، مجھ کو مسیحیت سے سخت بیزاری ہو گئی ہے۔ میں قرآن کو پڑھتا ہوں۔ اس کے بہت سے مواقع پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز میرے دل کو جھوڑ رہی ہے۔ محمدؐ نے براہ راست خدائے واحد کی طرف راستہ کھولا۔ یہاں انسان خدا سے بات کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسیحیت کی مثال ایسی ہے کہ انسان ہلو، ہلو کرتا رہے اور دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئے۔

اس طویل خط کے آخر میں مصنف لکھتے ہیں: فی هذا النص لتمين يقرر رلكه بعدائه للمسيحية واعجابه بالاسلام (صفحہ ۱۲۷)

جرمنی سے جدید مسلم تاریخ کے بہت سے واقعات وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) کے وقت دو عالمی محاذ بن گئے تھے۔ ایک الائیڈ پاورس کا محاذ جس کی قیادت برطانیہ کر رہا تھا۔ دوسرا ایکسس پاورس کا محاذ جس کی قیادت جرمنی کر رہا تھا۔

اس وقت ترکی میں عثمانی خلافت قائم تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ ترکی دونوں محاذوں میں سے کس کا ساتھ دے۔ اس نازک موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے رات دن جاگ کر ایک لمبا مضمون لکھا جو ان کے انگریزی ہفت روزہ کامریڈ میں چھپا۔ اس میں انھوں نے ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ اس

جنگ میں وہ برطانیہ کے مقابلہ میں جرمنی کا ساتھ دیں۔ اس کا عنوان تھا ترکوں کا انتخاب :

The Choice of the Turks

مولانا محمد علی کا یہ طویل مضمون الفاظ کا ایک جنگل تھا جو تدبیر اور دور اندیشی سے یکسر خالی تھا۔ تاہم اس مضمون کی بنا پر نہیں بلکہ ترکی کے جذباتی وزیر جنگ انور پاشا کے جلد بازانہ اندازہ (hasty calculation) کی وجہ سے ترکی جرمنوں کی حمایت میں جنگ میں کود پڑا۔ اگرچہ ترک کیبنٹ کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ ترکی کو اس معاملہ میں غیر جانب دار (neutral) رہنا چاہیے۔

حالات کے عین فطری تقاضے کے تحت اس جنگ میں برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کو فتح حاصل ہوئی اور جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو بری طرح شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر بعد از جنگ سودابازی (Postwar bargaining) شروع ہوئی۔ فاتح طاقتوں نے ترکی کی عثمانی خلافت کو تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

مثلاً روس نے درۂ دانیال پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے شام پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ برطانیہ نے مصر کو اپنے سیاسی دائرہ میں شامل کر لیا۔ فلسطین کو ایک انٹرنیشنل علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ کو بالفور ڈکلریشن (Balfour Declaration) جاری ہوا جس میں یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک نیشنل ہوم بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ وغیرہ۔ (13/790)

عثمانی خلافت کا خاتمہ اور فلسطین کے محاذ پر پسپائی جیسے حادثات جن کو نادان لوگ کمال اتاترک اور یاسر عرفات کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں، وہ حقیقۃً انور پاشا اور محمد علی جیسے لیڈروں کے حصہ میں جاتا ہے جن کے پاس جذبات کا سرمایہ تو ضرورت سے زیادہ تھا مگر بصیرت کا سرمایہ ضرورت سے بہت کم۔

دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کی جذباتی قیادت کے نتیجہ میں دوبارہ جرمنی کو شکست ہوئی۔ فاتح قوموں (برطانیہ، امریکہ، روس) نے جرمنی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ایک کو ایسٹ جرمنی کہا گیا اور دوسرے کو ویسٹ جرمنی۔ یہ تقسیم یہاں تک پہنچی کہ دونوں حصوں کے درمیان ۱۹۶۱ میں عظیم برلن وال کھڑی کر دی گئی۔ مگر جیسے ہی سوویت یونین کمزور پڑا خود جرمنوں نے نومبر ۱۹۸۹ میں اس دیوار کو توڑ کر گرا دیا اور دونوں حصے مل کر دوبارہ ایک ملک بن گئے۔

ایک بار میں نے پاکستان کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے کہا کہ اسی طرح انڈیا اور پاکستان کو بھی دوبارہ مل جانا چاہیے۔ موجودہ مصنوعی حدبندی کو اگر ختم کر دیا جائے تو اس میں دونوں کو فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جرمنی میں تو دونوں حصوں کے لوگ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں مذہبی اعتبار سے بھائی بھائی تھے۔ مگر یہاں کا معاملہ یہ ہے کہ دونوں کا مذہب الگ الگ ہے۔ مزید یہ کہ ہندو فرقہ اکثریت میں ہے۔ اگر ایسا غیر مساوی اتحاد کیا گیا تو ہندو اپنی اکثریت کے زور پر ہم کو نگل جائے گا۔

میں نے کہا کہ یہ ایک لغو بات ہے۔ یہ اسلام کی نظریاتی طاقت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ خود پاکستان کی تاریخ اس اندیشہ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ پاکستان کا علاقہ ہمیشہ سے مسلم علاقہ نہیں تھا۔ آج وہاں ایک سو ملین سے زیادہ مسلمان پائے جاتے ہیں۔ جب کہ ہندوؤں کی تعداد بمشکل صرف ۱۰ لاکھ ہے۔ مگر شروع میں جب مسلمان اس علاقہ میں آئے تو وہاں آبادی کا تناسب اس کے بالکل برعکس تھا۔ پھر ماضی کے اس تجربہ کے باوجود مستقبل کے لیے آپ لوگ اس قدر خوف اور مایوسی میں کیوں مبتلا ہیں۔ آپ لوگ کیسے مسلمان ہیں کہ آپ کی نگاہ ہندو کی عددی برتری پر تو ہے مگر آپ کی نگاہ اسلام کی نظریاتی برتری پر نہیں۔

جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار فی صد ہے۔ یہاں تقریباً چالیس اسلامی تنظیمیں ہیں۔ پہلی عالمی جنگ میں ترکی جرمنوں کے ساتھ تھا۔ اس طرح جنگ کے دوران فوجی خدمت کے تحت ترکی اور یوگوسلاویہ کے حامی مسلمان جرمنی پہنچے۔ انھوں نے یہاں پہلی مسجد بنائی۔ اب یہاں کے تقریباً ہر شہر میں بڑی تعداد میں مسجدیں اور اسلامی مراکز ہیں۔ ان کے ساتھ تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں۔ ان اداروں میں دس ہزار سے زیادہ مسلم بچے قرآن اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جرمنی کے ایک شہر ہائیڈلبرگ میں ۱۹۹۱ میں ایک بڑی اسلامی مؤتمر ہوئی۔ اس کا شعار تھا: الا ان نصر اللہ قریب۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ حالات میں اس شعار میں قومیت کی بو محسوس ہوتی ہے۔ یہ گویا قومی مقصد کے لیے قرآن کا استعمال ہے۔ اس کے بجائے زیادہ بہتر یہ تھا کہ کسی دعوتی آیت کو شعار بنایا جائے۔ راقم الحروف نے تقریباً چالیس سال پہلے اعظم گڑھ کی نمائش میں ایک اسلامی اسٹال لگایا تھا۔ اس میں عمودی (vertical) انداز میں ایک بہت اونچا بورڈ نصب کیا تھا جس پر یہ آیت مع ترجمہ لکھی ہوئی تھی: واللہ یدعو الی دار السلام۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو بون (جرمنی) میں سبھاش چندر بوس پر ایک سیمنار ہوا۔ اس کو یہاں کے ہندستانی سفارت خانہ نے اسپانسر کیا تھا۔ سبھاش چندر بوس ۴۳-۱۹۴۱ میں جرمنی میں رہے تھے۔ ان کے جرمنی آنے کا مقصد یہ تھا کہ برٹش راج ختم کرنے کے لیے جرمنی سے مدد حاصل کی جائے۔ اس وقت جرمنی میں نازی پارٹی کی حکومت تھی۔

لوئی فشر نے اپنی کتاب لائف آف مہاتما گاندھی میں لکھا ہے کہ سبھاش چندر بوس ایک طوفانی آدمی تھے جن کا کہنا تھا کہ مجھ کو خون دو، اور میں تم سے آزادی کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس نعرہ کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی (صفحہ ۲۵۶)

سبھاش چندر بوس (اور جواہر لال نہرو) اس زمانہ میں نوجوانوں کے مقبول رہنما بنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں فوراً آزادی چاہتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ لڑائی چھیڑنے کے لیے تیار تھے۔ دونوں مہاتما گاندھی کے مصالحانہ رویہ پر نہایت سخت احتجاج کر رہے تھے (صفحہ ۲۶۱) ان کے اثر سے گاندھی جی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ تک انڈیا کو آزاد کر دیا جائے، ورنہ میں یک طرفہ طور پر آزادی کا اعلان کر دوں گا اور اپنی تمام کشتیاں جلا ڈالوں گا (صفحہ ۲۵۷)

سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے سخت مخالف تھے (۲۶۹) گاندھی جی کا نظریہ پر امن جدوجہد کا تھا، جب کہ سبھاش چندر بوس کھلے طور پر تشدد کی بات کرتے تھے اور برطانیہ کے خلاف مسلح بغاوت (armed revolt) کے وکیل تھے (۳۴۲) لوئی فشر نے ۲۵ جون ۱۹۴۶ کو نئی دہلی میں گاندھی جی سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ سبھاش چندر بوس ۱۹۴۴ میں جرمنی گئے۔ اگر ان کا خیال تھا کہ وہ جرمنی سے مدد لے کر انڈیا کو بچا سکتے ہیں تو وہ ایک بیوقوف آدمی تھے اور سیاسی لیڈر بے وقوفی کا تحمل نہیں کر سکتا:

> Bose went to Germany. If he believed that India would be saved by Germany, he was stupid, and statemen cannot afford to be stupid. (p. 442)

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل آرمی کے نام سے ایک آزاد فوج بنائی تھی۔ اس کے ایک کیپٹن ڈاکٹر رتن چند (سری گنگا نگر) تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے جس کا عنوان ہے: ایک شام نیتاجی کے ساتھ۔ اس میں وہ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۴ کی ایک میٹنگ کا حال بیان

کرتے ہیں جب کہ نیتاجی برما کے باتو پہاٹ آفیسرز ٹریننگ اسکول کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو سوال و جواب یہ تھا:

سوال: آپ کہتے ہیں کہ ہتھیار بند انقلاب کے بغیر ہندستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ تو سوال یہ ہے کہ ہتھیاروں کا انتظام کیسے ہوگا؟

جواب: ہندستان میں بہت سے ہتھیار پہلے ہی سے موجود ہیں۔ آپ لوگوں کا کام ان کو چھیننا اور ان کو اپنے استعمال میں لانا ہے۔ مثال کے طور پر میں چٹاگانگ کے اسلحہ خانہ کی ڈکیتی کا ذکر کرتا ہوں۔ جس طرح وہاں سے ہتھیار چھینے گئے تھے اسی طرح اگر ہندستانی کوشش اور ہمت کریں تو باہر سے ہتھیار لانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سوال: جاپانیوں نے ہماری سرکار کو تسلیم کیا ہے۔ ہمیں ہر طرح کی مدد بھی دے رہے ہیں مگر وہ ہماری عزت نہیں کرتے۔ ان کے سپاہی ہمارے افسروں کو سلوٹ تک نہیں کرتے۔ پورٹ ڈکسن میں جب ہم جاپانیوں سے ٹریننگ لینے گئے تھے تو ہم نے اپنے جاپانی انسٹرکٹر سے کہا کہ آپ ہمیں ایک آزاد حکومت کے افراد تسلیم کرتے ہوئے بھی ہمارے افسروں کی عزت نہیں کرتے۔ جاپانی انسٹرکٹر نے جواب دیا کہ آپ کی آزاد حکومت آخر بنائی ہوئی کس کی ہے؟

جواب: چند ایک افراد کے غلط رویہ اور بددماغی کے کارن ہم سب جاپانیوں کو برا نہیں کہہ سکتے۔ (ہند سماچار، جالندھر، ۲۳ جنوری ۱۹۹۵)

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۷۶۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز چلنا شروع ہوا تو اعلان کرنے والی خاتون نے خالص ہندی لہجہ میں یہ الفاظ کہے: لفتھانسا کی اس اڑان پر ہم آپ کا ہاردک سواگت کرتے ہیں۔ لفتھانسا ایک جرمن کمپنی ہے۔ مگر اس کی موجودہ پرواز میں زیادہ تر ہندستانی مسافر ہیں۔ اس لیے مسافروں کی رعایت سے انھوں نے کلام کا یہ انداز اختیار کیا۔

تاجر کو جو تعلق اپنے گاہک سے ہوتا ہے، داعی کو وہی تعلق اپنے مدعو سے ہوتا ہے۔ لوگوں میں اگر دعوتی جذبہ آجائے تو وہ اپنے مدعو کے لیے اِسی طرح سراپا ہمدردی بن جائیں گے۔ وہ یک طرفہ طور پر مدعو کی رعایت کریں گے۔ وہ اپنے جذبات سے زیادہ مدعو کے جذبات کا لحاظ کریں گے۔ تاجر اگر اپنے گاہک کی رعایت نہ کرے تو وہ اپنے گاہک کو کھو دے گا، اسی

طرح داعی اگر اپنے مدعو کی رعایت نہ کرے تو وہ مدعو کو دور کرنے کا سبب بن جائے گا۔

۳۰ نومبر کی رات کو لفتھانسا کی فلائٹ میں میرے لیے جو کھانا آیا، اس کی پیکنگ پر جرمن میں میرا نام چھپا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ جرمن اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ اپنی پسند کے کھانے کا لطف اٹھائیے :

enjoy your meal

دہلی میں رزرویشن کے وقت یہ لکھوا دیا گیا تھا کہ مجھے سفر میں انڈین ویجیٹیرین میل چاہیے۔ حسب قاعدہ یہ ہدایت ہر جگہ کے کمپیوٹر پر ریکارڈ ہو گئی۔ چنانچہ اس سفر میں آتے اور جاتے ہوئے میں نے چار جہاز استعمال کیے جو تین مختلف کمپنیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہر ایک میں خود بخود "اسپشل میل" کے لیبل کے ساتھ میرا مطلوب کھانا میرے لیے آتا رہا۔ موجودہ جہاز جس میں میں نے فرینکفرٹ سے دہلی کا سفر کیا، اس میں تقریباً ساڑھے چار سو سیٹیں تھیں۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کمپیوٹر اور انڈسٹریل تہذیب نے کیسا نظام بنایا ہے اور کس طرح وہ عالمی سطح پر نہایت صحت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

یہ فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ساڑھے سات گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد رات کو ڈیڑھ بجے ہمارا جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہاں جہاز سے نکل کر باہر جانے کے لیے آدمی ایک لمبی گیلری سے گزرتا ہے۔ ایک طرف یہ گیلری ہے اور دوسری طرف وسیع انتظار گاہ ہے۔ دونوں کے درمیان شیشہ کی دیوار حائل ہے۔ اس طرح دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

جس وقت میں گیلری سے دوسرے ہم سفر لوگوں کے ساتھ باہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگ انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ یہاں اس انتظار میں تھے کہ آگے جانے والے جہاز سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو سکیں۔

اس دنیا میں ہر اسٹیشن اور ہر ایرپورٹ پر یہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ ہر وقت کچھ لوگ آتے ہیں اور کچھ لوگ واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کے اعتبار سے ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہو کر دنیا میں آ رہے ہیں۔ کچھ اور لوگ اپنی مدتِ قیام پوری کر کے آخرت کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ آنا اور جانا اسی طرح جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آ جائے اور دو دنیاؤں کے نظام کو ختم کر کے صرف ایک دنیا کا نظام ابدی طور پر قائم کر دیا جائے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

اُردو	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	50/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	70/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	40/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	70/-
اسلام اور عصر حاضر	50/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	—
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	—
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	95/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	—
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	35/-
عقلیاتِ اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	—
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیات طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازدواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھولیش	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

English	Rs
God Arises	85/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	—
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	150/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے	25/-
جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

AL-RISAL BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333